لاحول ولا قوّة

مشکور حسین یاد

لاحول ولاقوۃ

(مزاحیہ مضامین)

مشکور حسین یاد

غالب پبلشرز

فہرست

ہنسنا ہنسانا

کوئی معمولی کام نہیں

یاد

انتساب

اُن کے نام

جو ہر حال میں مسکرانا جانتے ہیں

ہنسیے بھی اور ہنسایئے بھی

ورنہ ....

دیباچہ

لاحول کا مسئلہ

"پیارے مشکور! میری جان! میرے دل! یقین کرو تم بہت خوبصورت ہو، بہت حسین ہو، بلا کے عقلمند! اپنے زمانے کی بے مثال شخصیت"۔۔۔ میں یہ الفاظ سُن کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اب جو ذرا آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں شیطان سَر جھکائے میرے کانوں میں مسلسل پھونکیں مار رہا ہے۔

آپ جانتے ہیں آدمی کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ شیطان کی دوستی ہو یا دشمنی دونوں ہی نہایت خطرناک ہیں، خطرناک اس اعتبار سے کہ دونوں ہی چٹپٹی اور مسالے دار ہوتی ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو شیطان کی شیطینت کا خطرناک پہلو ہی یہ ہے کہ اُس کے حصار میں آ کر آدمی دوستی اور دشمنی یعنی اچھے اور بُرے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو میری یہ بات پسند نہ آئے۔ میں ایک اعتبار سے اچھائی اور بُرائی دونوں ہی کا قائل بھی ہوں اور قدردان بھی، بالکل اسی طرح، جس طرح آپ اندھیرے اور اُجالے کے قائل بھی ہیں اور قدردان بھی ــ لیکن اندھیرا اور اُجالا اسی وقت تک اندھیرا اور اُجالا ہے جس وقت تک یہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم ہیں یا ان دونوں کو اِن کی اپنی اپنی جگہ پر آپ میں دیکھنے کی ہمت اور سکت باقی ہے۔ شیطان کی سب سے بڑی دشمنی یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان سے حقائقِ حیات کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کی ہمت اور سکت چھین لیتا ہے ــ فریبِ نظر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دیکھنے والا آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے، بلکہ فریبِ نظر کے معنی یہ ہیں کہ دیکھنے والا حقائق کو کچھ سے کچھ بنا کر دیکھ رہا ہے۔ قدرت نے اِنسان کو حقائقِ حیات کی چھان پھٹک

کرنے کا ملکہ پوری طرح ودیعت فرمایا ہے۔ شیطان ہر وقت انسان کی اسی صلاحیت پر کاری ضرب لگانے کی گھات میں رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ انسان ہر لحظہ فنا ہونے والی اس دنیا کی صحیح حقیقت کو سمجھ سکے۔ اگر انسان دنیا کی صحیح حقیقت اور اُس کے صحیح مقام کو پالے تو پھر شیطان کے چکّر میں کبھی نہ آئے۔ بہر حال شیطان انسان کو مسلسل دھوکا دیتا رہتا ہے۔ فنا کو بقا بنا کر پیش کرنا اُس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

شیطان کی سب سے بڑی طاقت بھی یہی دھوکا اور فریب ہے جسے ہم اور آپ روزمرہ کی زبان میں جھوٹ کا نام دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جھُوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن جھوٹ کو سمجھنے کے لیے آنکھیں کھولنا بے حد ضروری ہے۔ اگر آپ کی آنکھیں بند ہیں تو جھُوٹ سے زیادہ بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت نہیں۔ عام طور پر لوگ اِس لیے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ جھُوٹ کے اس پہلو پر غور نہیں کرتے۔ شیطان آدمی کو آنکھیں نہیں کھولنے دیتا۔ اِسی لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ بزعمِ خود شیطان پر سوار ہو کر چلتے ہیں، لیکن دو قدم بھی نہیں اُٹھاتے کہ پتہ چلتا ہے آپ شیطان پر سوار نہیں بلکہ شیطان آپ پر سوار ہے۔ آپ نے شیطان کو ایک سواری کا جانور سمجھ کر اُس کی پیٹھ پر بیٹھنے کی سعی فرمائی تھی، مگر معاملہ اُلٹ ہو گیا۔ اِسی اُلٹ معاملے کو سیدھا کرنے کے لیے آدمی لاحول بھیجتا ہے۔

لاحول بھیجنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک غصّے میں آکر، دوسرے ہنستے ہوئے۔ غصّے کے ساتھ لاحول بھیجنا خاصا تکلیف دِہ عمل ہے اور پھر بات صرف تکلیف تک محدود نہیں رہتی اِس طرح لاحول بھیجنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ غصّے میں آکر لاحول بھیجی جائے تو شیطان پر بے اثر رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے غصّے بھری لاحول کو سُن کر شیطان بھاگتا نہیں، بلکہ لاحول بھیجنے والے پر اپنی سواری مزید مضبوط کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ ہنس کر لاحول پڑھیں گے تو شیطان سَر پر پاؤں رکھ کر فوراً بھاگ جائے گا۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ شیطان آپ کو مضبوط و مستحکم اور خوش حال نہیں دیکھنا چاہتا۔ بظاہر وہ سبز باغ دکھاتا ہے باطن میں اُس کے پاس خزاں کی ویرانی اور برہنہ پن کے سوا کچھ نہیں۔ لاحول شیطان کے باطن تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

کائنات اور مخلوقاتِ عالم میں سب سے بڑی طاقت، سب سے بڑی بلندی اور

سب سے بڑی عظمت انسان کی ہے۔ جیسے ہی انسان میں اپنی اِس قدر و منزلت کا احساس کم ہونے لگتا ہے شیطان کا وجود اُبھر کر اُس کے سامنے آتا ہے۔ انسان سراپا یقین ہے شیطان سراپا بے یقینی ــــ بغور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خدا اپنی بڑائی کا اعلان کر کے بھی دراصل انسان کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں خدا تو خدا ہے اُسے کیا غرض پڑی تھی کہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ڈنکے بجاتا پھرتا۔ یہ سب اہتمام انسان کے لیے ہے۔ انسان کو اُس کی عظمت کا یقین دلانا آسان کام نہیں۔ اُسے جیسے ہی اپنی طاقت اور بڑائی کا اندازہ ہوتا ہے اُس کے ہاتھ پاؤں پھُولنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت میں خدا کے سوا اُس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، لیکن خدا انسان کو عجیب انداز میں سہارا دیتا ہے۔ آپ لاحول پڑھتے ہیں تو آپ کی کمزوری یعنی شیطان دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے اور آپ کے تمام وجود میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ آپ خود کو بے حد تازہ دم محسوس کرتے ہیں۔ گویا جم کر لاحول بھیجی جائے تو ماحول میں تازگی کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

عام زندگی میں انسان کی سمجھ بڑی کارآمد چیز ہے، لیکن عظمت اور بڑائی کے حوالے سے انسان کی سمجھ نے ہمیشہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے تو فرعون بن جاتا ہے۔ اور فی الواقعی بڑا ہو جائے تو موسیٰ ــــ گویا لاحول کی تلاوت انسان کو بڑا سمجھنے پر مائل نہیں کرتی، بلکہ بڑا بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔

یہ سراسر غلط اور جھوٹ ہے کہ شیطان کسی کارآمد شعور یا ادراک کا نام ہے۔ شیطان کی تمام تر عقل خسارہ کی طرف جاتی ہے۔ یہ نقصان کا دوسرا نام شیطان ہے۔ اسی لیے ہم لاحول بھیج کر اپنے آپ کو نقصان سے امان میں رکھنا چاہتے ہیں؛ البتہ اگر یہ کام ہم ہنس کر یعنی خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے ہیں تو تیر نشانے پر بیٹھتا ہے، رو کر کرتے ہیں تو ہمارے آنسوؤں کے موتی بھی بیکار جاتے ہیں اور شیطان پھر ہماری گردن پر جوں کا توں سوار ہوتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہنسنا ہنسانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

میں نے اِن چند سطروں میں ابھی تک جو فلسفہ بھگارنے کی کوشش "فرمائی" ہے اس سے آپ نے یہ اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ اس کتاب کا نام لاحول ولاقوۃ کیوں رکھا ہے۔ محض خیالی

مضامین تو میں لکھنے کا بالکل قائل نہیں ہوں، بلکہ کوئی لکھنے والا بھی ایسا نہیں کرتا۔ مضمون کا اصل مواد تو روزمرہ کی زندگی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری تحریروں میں واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور زیبِ داستاں کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں بہت ہی کم۔ ویسے میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ قاری کے لیے یہ اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے کہ اصل واقعات کیا ہیں اور زیبِ داستاں کے لیے کون کون سا اضافہ کیا گیا ہے۔ یوں قاری کو اس بات کی کھوج لگانا بھی نہیں چاہیئے اس کا کام آم کھانا ہے، پیڑ گننا نہیں پھر بھی میں یہاں یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جن واقعات کو میں نے جوں کا توں لکھ دیا ہے انہیں قارئین نے جھوٹ یا بناوٹی سمجھا اور جن واقعات کی تخلیق میرے ذہن کا نتیجہ تھی انہیں سچ اور واقعیت پر مبنی تصوّر کیا گیا۔ گویا بعض وقت یا عام حالات میں حقیقت واقعات سے کہیں زیادہ غیر حقیقی یا حیران کُن ہوا کرتی ہے یا ہو جاتی ہے۔ سچّی بات ہے میں تو جب بھی خود ہنسنا چاہتا ہوں یا دوستوں کو ہنسانا میرا مقصود ہوتا ہے تو میں اور کچھ نہیں کرتا کسی واقعہ کو من وعن بیان کر دیتا ہوں اور اِس سیدھی سادھی سی ترکیب کے سبب مجھے خود بھی ہنسی آجاتی ہے اور میرے احباب بھی خوش ہو لیتے ہیں؛ البتّہ یہ ضرور ہے جس چیز کو زندگی یا فن کی بے ساختگی کہتے ہیں وہ عام زندگی میں بہت کم ظہور میں آتی ہے۔ غالباً فن کار کی بڑائی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی مشق یا خداداد صلاحیتوں کے طفیل اس بے ساختگی کو بار بار سامنے لے کر آتا ہے۔ دراصل بے ساختگی ایک الوہی صفت ہے۔ اللہ نے کائنات کی تخلیق کے وقت بھی تو صرف لفظِ کُن کہا تھا یعنی ہو جا اور کائنات وقوع میں آگئی۔ گویا بے ساختگی کوئی عام صفت نہیں ہے کہ جلدی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے بہت کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بہر حال آپ کو میرے اِن مضامین کے جن واقعات میں بے ساختگی نظر آئے سمجھ لیجئے انہیں صفحۂ قرطاس پر وقوع میں لانے کے لیے میں نے کچھ نہ کچھ زور لگایا ہے اور جہاں آپ کو واقعات کے ربط و تسلسل میں گڑبڑ دکھائی دے یا وہ واقعات عام زندگی سے ہٹ کر محسوس ہوں تو جان لیجئے کہ یہ واقعات اصلی ہیں۔ ان میں مصنّف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں ملایا — گویا یہ خالص ہیں۔

اس کتاب سے قبل جب میرے مزاحیہ مضامین کی پہلی کتاب "اپنی صورت آپ" چھپی اور اُسے میرے محترم اُستاد سید وزیر الحسن عابدی مرحوم نے ملاحظہ فرمایا تو کہنے لگے، "مشکور! آپ نے یہ مضامین لکھ کر اُردو میں ایک نئی صنفِ ادب کا اضافہ کیا ہے"۔ میں نے پوچھا، "جناب وہ کونسی صنفِ ادب ہے"۔ فرمایا، "خود آشوب" اور پھر میرے استفسار پر اس کی تشریح یوں فرمائی، "آپ ہر مضمون میں اپنی ذات کو اس طرح پھنسا لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ عزیزم یقین کیجیے کہ یہ ایک بالکل نئی صنفِ ادب ہے"۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ حُسنِ اتفاق سے "اپنی صورت آپ" میں ایک ہی انداز کے مضامین جمع ہو گئے تھے زیرِ نظر تصنیف میں بھی ایسے مضامین کی کثرت ہے جس میں میری ذات ہدف بنتی ہے تاہم اس میں ایسے مضامین بھی آپ کی نظر سے گزریں گے جن میں میری ذات آشوب میں مبتلا تو ضرور ہوئی ہے، لیکن صاف طور پر بچ بھی گئی ہے۔ یہ مضامین قریب قریب گزشتہ پانچ برس کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

مشکور حسین یاد
۸ ر بہادر شاہ ظفر کالونی، ندیم شہید روڈ
سمن آباد۔ لاہور

شیطانی سواری

ہمارا خیال ہے ہم فطرتاً ایسے تنگ نظر نہیں ہیں جیسا بزرگوں نے ہمیں بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم عورت کو بالکل انسان کی اولاد سمجھتے ہیں اسی لئے اسے مرد سے کسی طرح کم نہیں مانتے، لیکن بزرگوں کے بار بار کہنے پر ہم نہ صرف شک میں پڑ گئے، بلکہ عورت کو فی الواقعی اپنے سے کوئی گھٹیا قسم کی مخلوق (نہ سمجھتے ہوئے بھی) سمجھنے لگے۔ ابھی ہماری شادی ہونے ہی والی تھی کہ ہمارے کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں: "اگر صحیح معنوں میں شوہر بننا چاہتے ہو، تو یاد رکھو، بیوی کے مشورے پر کبھی عمل نہ کرنا۔" کوئی کہتا: "مشورے پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے سرے سے بیوی کو مشورے میں شریک ہی نہیں کرنا چاہیئے۔"

"مگر وہ شریکِ زندگی بھی تو کہلاتی ہے۔" ہم نے عرض کیا۔

"اس کا مطلب کچھ اور ہے۔" جواب ملا۔ ظاہر ہے ہم اس کافی وشافی جواب سے شریکِ زندگی کا مطلب تو کیا سمجھ سکتے تھے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بیوی کی ہر رائے کو لغو اور بے معنی خیال کرنا اپنے شوہر ہونے کی شان سمجھنے لگے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے بیوی نے کئی بار کہا: "لاہور میں سواری کا مسئلہ اچھا خاصا ٹیڑھا مسئلہ ہے، سائیکل آپ سے چلائی نہیں جاتی، کوئی اسکوٹر یا موٹر سائیکل خرید لیجیے۔" بات خاصی معقول اور قابلِ قبول تھی، لیکن ہم چونکہ اپنی جگہ ایک شوہر تھے اس لئے بیوی کی اس رائے پر کبھی دھیان نہ دیا۔ ہمارا خیال تھا ہم سائیکل سے اچھل کر ایک دم کار میں جا بیٹھیں گے۔ ویسے تو کار خریدنے کا ارادہ ہم نے ہوش سنبھالتے ہی کر لیا تھا، لیکن اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا اس وقت شروع کیا جب اپنے پیروں پر

آپ کھڑے ہو گئے، یعنی جب ہم نے ایک عدد ملازمت اختیار کرلی۔ اگرچہ اس وقت ہماری ملازمت سو سوا سو روپے ماہوار سے زیادہ کی نہ تھی، لیکن ہمارے ایک انجینئر دوست کی تنخواہ بھی اس وقت دو سو اڑھائی سو روپے ماہوار سے کون سی زیادہ تھی۔ اس نے ملازمت کے ایک سال بعد کار خریدلی۔ ہمارا خیال تھا اس حساب سے ہم دو سال بعد کار خریدلیں گے۔ لیکن اٹھائیس سال ہونے کو آئے آج تک یہ دو سال کا وقفہ ختم نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں کیا گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہم ہر سال تازہ ماڈل خریدنے کا پکا ارادہ کرتے ہیں، لیکن وہ سال گزر جاتا ہے اور کار گھر میں نہیں آتی۔ دوسرا سال شروع ہو جاتا ہے، تو ہم اس سال کے تازہ ماڈل پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں ہم بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ کار خریدنے کے بارے میں ہمارے ارادے میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا، بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں، جس قدر خلوص کے ساتھ ہم کار خریدنے کا ارادہ کرتے ہیں اتنا خلوص تو شاید ہم نے شادی کرانے کے ارادے میں بھی نہیں دکھایا تھا؛ حالانکہ ہمارے دوستوں کا خیال ہے ہم نے جس خلوص کے ساتھ شادی کا جُوا اپنے کاندھوں پر رکھا اس کی مثال شاید ہی انسانی تاریخ میں کہیں سے دستیاب ہو سکے۔

کار کے بارے میں ہماری وسیع النظری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہمیں کوئی عُمدہ کار ہی میسر آئے۔ ہمارے خیال کے مطابق ہر کار عُمدہ ہوتی ہے۔ کار کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے دو سے زیادہ پہیے ہوں اور اس میں جیسے تیسے ایک دفعہ آدمی گھس کر بیٹھ سکتا ہو۔ کار میں آرام سے بیٹھنا یا اسے عیّاشی کی کوئی چیز تصور کرنا ہماری نظر میں کار کی توہین کے مترادف ہے، بلکہ سچ پُوچھئے تو کار سے متعلق اس خیال کو ہم ایک فعلِ حرام قرار دیتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھ لیجئے کہ ہم نے صرف ایک ہی کار کے بارے میں سوچا ہے۔ سوچنے کو ہم نے ہر کار اپنے لائق سمجھی ہے۔ کار تو بس ملنی چاہیئے خواہ وہ اِمپالا ہو یا بیوک یا کوئی اور۔ یہی وجہ ہے ایک زمانے میں بقول ہمارے دوستوں کے ہم نہایت ہی سستی اور بھدّی فرانسیسی کار CITREON کو دیکھ دیکھ کر بھی اِس طرح آہیں بھرتے تھے جس طرح عشّاق اپنے محبوب کو دیکھ دیکھ کر جلتے ہیں۔ احباب ہمارا مذاق اُڑاتے اور ہم

انہیں کہتے "ظالمو! تمہیں کیا خبر اس کار میں کیسے کیسے گُن چھپے ہیں۔ یہ ایک گیلن میں ۹۰ میل چلتی ہے۔ چند ہزار میں خریدی جاسکتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں بیٹھ جاؤ تو دماغ خراب نہیں ہوتا۔ یہ قریب سے گزرتی ہے تو لوگ حسد کرنے کے بجائے دعائیں مانگتے ہیں یا اللہ اس میں بیٹھنے والے خیریت سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ سائیکل پر چلنے والے اور پیدل حضرات اس کے برابر سے اکڑ کر چلتے ہیں۔ غرض کار کیا ہے عجز و انکسار کی بے مثال علامت ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ اس میں بیٹھ کر آدمی خود کو کار میں بیٹھا ہوا محسوس نہیں کرتا۔ بس یہی احساس ہوتا ہے کہ یا تو ہم پیدل چل رہے ہیں یا کسی سواری کے جانور پر بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں CITREON میں بیٹھ کر تمام سواریوں میں بیٹھنے کا لطف آجاتا ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے ہم گدھے پر سوار ہیں، کبھی احساس ہوتا ہے گدھے پر نہیں اُونٹ پر بیٹھے ہیں، کبھی ایسا لگتا ہے گدھے اور اُونٹ پر نہیں کسی عُمدہ سے خچر پر بیٹھے چلے جارہے ہیں۔ یہی نہیں کبھی کبھی بیل گاڑی، تانگے اور ٹم ٹم کا خیال بھی آجاتا ہے اور بعض وقت تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ہم کسی کار وار میں نہیں بیٹھے، بلکہ گھر میں موجود ہیں اور کار میں بیٹھنے کا کوئی پریشان سا خواب دیکھ رہے ہیں۔

لاحول ولا قوۃ یہ ہم بھی کا قصہ کیا لے بیٹھے۔ اصل موضوع کی طرف آیئے۔ غرض بیوی کی رائے موٹر سائیکل خریدنے کی تھی، مگر ہم نے اختلاف کیا۔ اس کے علاوہ موٹر سائیکل نہ خریدنے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ہم اس سواری کو اپنی شان کے شایان نہ سمجھتے تھے۔ ہماری دانست میں موٹر سائیکل پر سوار ہونے کی ایک عُمر ہوتی ہے۔ اس عمر سے تجاوز کر جائے تو پھر آدمی کو موٹر سائیکل کا خیال ہی ترک کر دینا چاہیئے۔ موٹر سائیکل کو ہم قطعی طور پر چھوکروں کی سواری خیال کرتے ہیں۔ اس پر بیٹھ کر آدمی کبھی معتبر نظر نہیں آتا۔ ادھر ہمیں یہ ہمیشہ سے ہوس رہی ہے کہ ہم اور کچھ نظر آئیں یا نہ آئیں، لیکن دنیا والوں کو معتبر ضرور نظر آئیں۔ ہم نے اپنے کئی دوستوں کو دیکھا کہ وہ عام حالت میں زمین پر چلتے ہوئے یا کہیں بیٹھے اور لیٹے ہوئے اچھے خاصے معتبر نظر آتے ہیں، لیکن جیسے ہی اسکوٹر یا موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہیں ان کی تمام معتبری آنِ واحد میں جاتی رہتی ہے۔ وہی شخص جو ایک لمحہ پہلے اچھا خاصا سنجیدہ اور ثقہ نظر

آرہا تھا موٹر سائیکل پر بیٹھا تو ایک لاپروا اور غیر ذمّہ دار شخص دکھائی دینے لگا۔ یُوں کبڈی ہمارا محبوب کھیل رہا ہے اور ہم اپنے باریک ہاتھ پاؤں اور بالشت بھر کی چھاتی کے باوجود کبڈی کھیلتے رہے ہیں، لیکن لوگ سڑکوں اور بازاروں میں بھی کبڈی کھیلنا شروع کر دیں تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ بس ہمیں بھی موٹر سائیکل پر سوار آدمی ایسے ہی نظر آتا ہے جیسے مستقل طور پر کبڈی کھیل رہا ہو یا پالا ڈالنے کے لئے جا رہا ہو۔ ایک طرف تو اِدھر اُدھر ٹانگیں کر کے جھک کر موٹر سائیکل پر بیٹھنا اور دوسری طرف اِس پوز کے ساتھ موٹر سائیکل کی پیہم آواز ھٹا ھٹا ھٹا آدمی عین مین کبڈی کبڈی کی آوازیں لگاتا سُنائی دیتا ہے۔ اگر آپ دیہات سے دُور رہے ہیں یا آپ کو دیسی کھیل اچھے نہیں لگتے تو ایسی صورت میں موٹر سائیکل پر سوار شخص آپ کو یُوں دکھائی دے گا جیسے کوئی مُکّہ بازی کے لئے خود کو تیار کر رہا ہے۔ بہت سے افراد تو جُھک کر موٹر سائیکل کا ہینڈل اس مضبوطی سے پکڑتے ہیں جیسے واقعی مُکّہ بنا رہے ہیں۔

اِن حالات کی روشنی میں آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ہم موٹر سائیکل کو کس طرح ایک اچھی سواری خیال کر سکتے تھے، لیکن پچھلے دنوں ہوا یُوں کہ ہم سو فی صد موٹر کار خرید رہے تھے، مگر خرید لی موٹر سائیکل۔ اب یہ تو ہم بھی آپ کو تفصیل کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ موٹر کار کی موٹر سائیکل کِس طرح بن گئی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کل جو سواری ہمارے گھر میں دندناتی پھر رہی ہے وہ کار نہیں، بلکہ موٹر سائیکل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں موٹر کار کے بجائے موٹر سائیکل کی طرف ہمارا رُخ پھیرنے میں ایک تو ہمارے دونوں نوجوان بیٹوں کا ہاتھ ہے۔ دوسرے بیگم کی شرارت اور جذبۂ انتقام۔ بیٹوں نے موٹر سائیکل کی طرف ہمارا ذہن اس لئے بھی منتقل کیا کہ انہیں معلوم تھا کہ ہم خرید نہیں سکیں گے محض زبانی جمع خرچ کرتے ہیں: البتہ موٹر سائیکل خریدنے کی استطاعت ہم میں ہے، لہٰذا کیوں نہ وہ چیز خرید لی جائے جو خریدی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ویسے بھی موٹر کار کی نسبت نوجوانوں کو موٹر سائیکل چلا کر زیادہ لطف آتا ہے۔ بہر حال موٹر سائیکل ہمارے گھر میں آگئی۔

اب مسئلہ اسے چلانے کا تھا۔ ہمارے بیٹوں نے تو نہ معلوم کہاں سے اِسے چلانا سیکھ لیا تھا، لیکن اس ضمن میں ہم قطعی طور پر جاہل تھے۔ ہمیں قدرے متفکر دیکھا تو ہمارے منجھلے بیٹے

سید افسر رضا سلمہٗ نے کہا: "ابا جان! موٹر سائیکل چلانا تو بہت ہی آسان کام ہے"۔

ہم نے پُوچھا: "وہ کیسے؟"

"آیئے میں آپ کو سکھاتا ہوں"۔

"گویا تم میرے اُستاد بنو گے!"

"اس میں اُستادی شاگردی کی کونسی بات ہے"۔

"بات تو ہے"۔

"بہرحال آپ سمجھنا چاہیں تو مجھے اپنا اُستاد سمجھ لیں، میں آپ کو شاگرد خیال نہیں کروں گا"۔

ہم نے بھی سوچا اب گھر میں یہ سواری آ ہی گئی ہے تو اسے چلانا بھی پڑے گا، کیوں نہ کسی غیر کے بجائے اپنے بیٹے ہی سے اسے چلانا سیکھ لیا جائے۔ پہلے تو ہمیں برخوردار نے کھڑے کھڑے ہی سمجھایا: "دیکھئے اس طرح گاڑی اسٹارٹ کر کے بائیں ہاتھ سے کلچ دبائیے اور اس کے ساتھ ہی بائیں پاؤں کے پنجے پر زور ڈالئے، ایسا کرنے سے پہلا گیئر لگ جائے گا۔ کلچ کو آہستہ آہستہ چھوڑیئے اور دائیں ہاتھ سے تھروٹل کے ذریعے رفتہ رفتہ سپیڈ دیجئے، جس وقت گاڑی چل پڑے تو چند قدم کے بعد ہی کلچ دبا کر دوسرا گیئر لگا دیجئے، یعنی پاؤں آگے کی طرف ماریئے۔ اور جب گاڑی مزید رفتار پکڑ لے تو تیسرا گیئر لگا ڈالئے۔ اگر سامنے کوئی چیز آ جائے تو فوراً دائیں پاؤں کے پنجے کو دبایئے، بریک لگ جائے گا اور گاڑی ٹھہر جائے گی، لیکن یہ پاؤں والا بریک پچھلے پہیے کا ہے۔ دائیں ہاتھ میں اگلے پہیے کا بریک ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے پچھلے پہیے کا بریک لگایا جائے اور اس کے فوراً بعد اگلے پہیے کا۔ یاد رکھیے اگر اگلے پہیے کا بریک لگائیں گے، پچھلے کا نہیں تو گاڑی اُلٹ جائے گی۔ یہ باتیں آپ نے سمجھ لیں تو جان لیجئے کہ آپ کو گاڑی چلانا آ گئی"۔ یہ کہہ کر برخوردار نے خیال کیا کہ ہم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے: چنانچہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا: "اچھا تو پھر بسم اللہ گاڑی چلایئے"۔

"گاڑی کس طرح چلاؤں؟"

"جس طرح میں نے بتایا ہے"۔

"تم نے کس طرح بتایا ہے؟"

"ابا جان! ابھی ابھی تو میں نے آپ کو ساری باتیں سمجھائی ہیں۔"

برخوردار نے اس انداز سے یہ فقرہ ادا کیا جیسے کہہ رہا ہو میں نے آپ پر بڑا احسان کیا ہے ڈرائیوری کے جملہ راز چشم زدن میں بتا ڈالے، کوئی اور ہوتا تو یوں تھوڑی سی دیر میں اتنی ساری باتیں کبھی نہ بتاتا۔ ایک ایک بات بتانے میں اُستاد لوگ ایک ایک سال گزار دیتے ہیں۔

ہم نے کہا: "اتنی ساری باتیں بتانے کے بجائے صرف ایک بات بتاؤ کہ گاڑی اسٹارٹ کس طرح لیتی ہے۔"

"دیکھیے اس وقت میٹر کے سامنے ہری بتی روشن ہے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ گاڑی نیوٹرل گیئر میں ہے۔ اب آپ ہلکی سی کِک لگایئے۔ آپ کے دائیں پاؤں کی ایڑی کے پاس ...."

"تم نے کِک مارنے کو کہا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن کِک کس کو ماروں؟"

"یہ جو آپ کے دائیں پاؤں کی ایڑی کے پاس ڈنڈا سا ہے اِس پر پاؤں کا پنجہ رکھ کر ذرا زور کے ساتھ پیچھے کو دھکیلیے۔"

"پیچھے کو دھکیلوں؟"

"جی پیچھے کو۔"

"اور پھر تم یہ بھی کہہ رہے ہو کہ کِک لگاؤں۔"

"آپ نے درست سمجھا۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"معاف کیجیے اس میں نہ ہونے والی بات کیا ہے؟"

"ارے برخوردار کِک آگے کو لگائی جاتی ہے تم کہتے ہو پیچھے کو دھکیلوں۔ سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ اباجان دولتّی ماریئے۔ مَیں نے لوگوں کو موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے دیکھا

ہے۔ اس نامعقول سواری پر سوار ہونے سے قبل یہی مصیبت ہے کہ گدھے کی طرح مسلسل دولتّیاں چلانا پڑتی ہیں۔"

"ہماری گاڑی نئی ہے یہ جلدی اسٹارٹ ہوجاتی ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسے چلانے کے لئے زیادہ دولتّیاں نہیں مارنا پڑیں گی۔ بہتر ہے، اللہ کا نام لے کر دولتّی کا آغاز کرتا ہوں۔" اور واقعی ہم نے معمولی سی دولتّی چلائی تھی کہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔ "اب کیا کروں؟"

"بائیں ہاتھ سے کلچ دبائیے۔"

"دبالیا۔"

"اب بائیں پاؤں کے نیچے پر زور ڈالئے۔"

"یہ بھی کرلیا۔"

"بس اب آہستہ آہستہ کلچ بھی چھوڑیے اور دائیں ہاتھ سے تھروٹل کو اپنی طرف گھمائیے۔"

بھوں... گھوں... گھوں... گھاؤں۔

"ارے ابّا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تھروٹل کو بھی آہستہ آہستہ۔"

"اچھا... اچھا سمجھ گیا۔" یہ کہہ کر ہم نے تھروٹل کو واپس اپنی جگہ پر کیا اور کلچ چھوڑنا شروع کر دیا اور گاڑی بھُس کر کے رُک گئی۔

"یہ رُک کیوں گئی؟" ہم نے پوچھا۔

"آپ نے کلچ چھوڑ دیا، لیکن تھروٹل کو اپنی طرف نہیں گھمایا۔ اب دوبارہ سب کچھ اسی طرح کیجئے۔" چنانچہ ہم نے ایک دولتّی چلائی۔ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد دو تین دولتّیاں اور ماریں، مگر گاڑی پھر بھی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ اپنے برخوردار اُستاد سے پوچھا گاڑی اسٹارٹ کیوں نہیں ہوئی؟ اس نے ایک دم ناراض سا ہو کر کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ گاڑی کو نیوٹرل پر تو لائے نہیں۔"

"نیوٹرل پر کیسے لاؤں؟"

"کلچ دبا کر بائیں پاؤں کی ایڑی کو نیچے ماریئے۔ یاد رکھئے پاؤں آگے کی طرف مارنے

سے گیئر بڑھتے جاتے ہیں اور گیئر کم کرنے کے لیے ایڑی سے کام لینا ہوتا ہے"۔

"گویا ایک دفعہ گیئر لگا کر اُسے واپس بھی لانا پڑتا ہے"۔

"اور کیا ایک دفعہ گیئر لگ کر ہمیشہ کے واسطے لگ جاتا ہے؟"

"لاحول ولاقوۃ موٹر سائیکل چلانا کیا ہُوا اوکھلی میں سر دینے والی بات ہوئی"۔

"گھبرائیے نہیں۔ شروع شروع میں ذرا دِقت محسوس ہوتی ہے۔ بعد میں آپ کو محسوس بھی نہیں ہوگا اور ہاتھ پاؤں اپنا کام کرتے چلے جائیں گے"۔

"گویا تم مجھے سمجھا رہے ہو؟" ہم نے پدرانہ رُعب کے ساتھ پوچھا۔

"غالباً آپ یہ بھول گئے ہیں کہ اس وقت میں آپ کا بیٹا ہی نہیں اُستاد بھی ہوں"۔ برخوردار نے قدرے آنکھیں نکال کر ہم پر ہماری صحیح پوزیشن واضح کرتے ہوئے جواب دیا۔ غرض ہم نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی، لیکن جیسے ہی کلچ دبا کر گیئر لگایا اور پھر کلچ چھوڑا تو اس دفعہ بھی بھول کر کے گاڑی رُک گئی۔ ہم گاڑی اسٹارٹ کرتے اور وہ بھول بھال کر کے اپنی جگہ رُک جاتی۔ اس عمل میں ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ اتنی دیر میں محلّے کے لڑکے بالے بھی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی کہتا "چچا جان موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہے ہیں"۔ کوئی کہتا "پھوپھا جی موٹر سائیکل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ کوئی کہتا "بے چارے ماموں جان کو موٹر سائیکل بھی چلانا نہیں آتا"۔ ایک طرف سے آواز آئی "کمال ہے ابھی تک تایا جی نے موٹر سائیکل چلانا بھی نہیں سیکھا" ہم یہ تمام باتیں سُن کر شرمندہ ہونے کے بجائے سخت غصّے میں مبتلا ہوئے جا رہے تھے۔ آخر کار کیا دیکھتے ہیں کہ موٹر سائیکل چل پڑی، لیکن اس طرح کہ پہلے اس نے ہلکی سی چھلانگ لگائی اور پھر دو قدم چل کر رُک گئی۔ اگرچہ اس تمام منظر پر لڑکوں نے بھرپور قہقہہ لگایا، لیکن ہم نے اسے اپنے لیے نیک شگون قرار دیا۔ کُفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ ہم نے دوبارہ کِک لگا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور کلچ دبا کر پہلا گیئر لگایا۔ کلچ آہستہ آہستہ چھوڑنا شروع کیا، لیکن اس بار بھی آرام سے چلنے کے بجائے اُس نے شریر بچھڑے کی طرح دُم دبا کر چھلانگ سی لگائی۔ موٹر سائیکل کی چھلانگ کچھ اتنی اچانک تھی کہ ہم اُوپر بیٹھے ہوئے مشکل ہی سے سنبھل سکے۔ بہر حال سنبھل گئے، لیکن پڑوسی کے کتّے کا بچّہ زد میں آ کر لنگڑا ہو گیا۔ سب لڑکوں نے ہمیں مبارکباد دی

کہ اب ہمیں موٹر سائیکل چلانا آجائے گا، کیونکہ ہم سے خواہ وہ چھوٹا ہی سہی ایک حادثہ عمل میں آگیا ہے۔ اِس نامُراد سواری کے لئے حادثے کا واقع ہونا ضروری ہے۔ چاہے اِس حادثے کی زد آپ کی اپنی ذات پر پڑی ہو یا کوئی دوسرا اس کا شکار بنے۔ یہ قسمت کی بات ہے۔ ہم کُتّے کے پلّے کی گریہ وزاری یعنی چیاؤں چیاؤں سے بے نیاز اس خوشی میں کہ ہمیں موٹر سائیکل چلانا آگئی چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ "اوئی اللہ میں مری، مجھے بچاؤ" کی آواز ہمارے کان میں پڑی۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ہماری ایک خالہ صاحبہ ہماری موٹر سائیکل کی زد میں آتے آتے بچ گئیں، لیکن محترمہ کا دوپٹہ پھر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ پچھلے پہیئے میں نمبر پلیٹ کے ساتھ اُلجھ گیا اور ہمارے پیچھے ہوا میں اس طرح لہراتا ہوا آرہا تھا جیسے ہماری موٹر سائیکل کے ایک اچھی خاصی رنگین قسم کی دُم لگی ہے۔ اُس شام ہمارا خیال تھا کچھ دیر گاڑی اور چلائیں، لیکن ہم اِس خیال سے باز آگئے۔ سوچا فی الحال دو حادثوں کا وقوع میں آجانا ہی کافی سمجھنا چاہیئے۔ مزید حادثے کے متحمل نہ ہم ہوسکیں گے اور نہ ہمارے محلّے والے۔

ہم نے اگلے روز پھر مشق کے لئے موٹر سائیکل باہر نکالی۔ ہم ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ مشق کے لئے کونسی جگہ موزوں ہوسکتی ہے کہ ہمارے اُستاد برخوردار نے پُوچھا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ مجھے موٹر سائیکل چلانے کی مشق کہاں کرنی چاہیئے؟"

"ہمارے محلّے سے بہتر جگہ اور کونسی ہوسکتی ہے۔ یہاں زیادہ آمدورفت بھی نہیں ہے اور دوسرے ... دوسرے ..."

"برخوردار! خاموش کیوں ہوگئے"

"بس آپ خود سمجھ جایئے"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اوّل تو ہمارے محلّے میں لوگوں کی آمدورفت کم ہے اور دوسرے ایک دو گھروں کو چھوڑ کر باقی تمام عزیز و اقارب ہی رہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی چھوٹا موٹا حادثہ رُونما ہو بھی گیا تو زیادہ جھگڑا نہیں بڑھے گا۔ عزیز آخر عزیز ہوتے ہیں"

"میرا بھی یہی خیال ہے" برخوردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ہم نے اللہ کا نام لے

کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ ابھی کلچ دبا کر پہلا گیئر ہی لگایا تھا کہ سامنے سے وہی شام والی خالہ آگئیں ایک دم چلا اُٹھیں: "خدا کے لئے ابھی گاڑی نہ چلانا، مجھے گزرنے دو"۔ خالہ صاحبہ اچھی طرح سامنے سے گزر گئیں تو ہم نے گاڑی چلانا شروع کی۔ حسبِ معمول ہماری موٹر سائیکل نے ایک چھلانگ لگائی اور بند ہونے کے بجائے تیزی سے چل پڑی۔ ہم ابھی اپنے آپ کو سنبھال ہی رہے تھے کہ ہم نے دیکھا ایک بزرگ ہماری زد میں آرہے ہیں۔ ہم نے دانت بھینچ کر بریک لگایا۔ کوئی حادثہ تو رُونما نہیں ہوا، لیکن ہم عجیب عالم میں پھنس گئے۔ جس طرف کو بزرگوار چلتے اسی سمت ہماری موٹر سائیکل مُڑ جاتی۔ آخر یہ محترم سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "میاں! مجھ پر موٹر سائیکل چڑھانا چاہتے ہو۔ لو میں کھڑا ہو گیا ہوں، مجھے کُچل کر اپنی خواہش پُوری کر لو"۔

ہم سخت پریشان تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد اُن سے جان بچائی، لیکن اس دن کے بعد سے معلوم نہیں ہمیں کچھ ہو گیا یا ہماری موٹر سائیکل کو، جہاں کوئی سامنے سے آتا یا جاتا ہم اور ہماری موٹر سائیکل اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ محلّے والوں نے دو چار دن یہ حال دیکھا تو بڑے پریشان ہوئے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس وقت ہم موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے گلی میں آنے جانے والے سب بھاگ کر اپنے اپنے مکانوں میں چھُپ جاتے۔ چھوٹے بچّوں کو تو مائیں قطعی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتیں۔ اوّل اوّل تو محلّے والوں کی اس حرکت سے ہمیں بھی شرم آئی، لیکن فائدہ یہ ہوا کہ ہماری کچھ مشق ہو گئی۔ اب ہم اعتماد کے ساتھ گاڑی چلانے لگے۔ اِدھر محلّے والوں نے جب دیکھا کہ ہماری ڈرائیونگ کوئی خطرے کی بات نہیں رہی تو ان کی آمدورفت بھی معمول پر آگئی۔ ہم اپنی موٹر سائیکل بھی گلی میں لئے پھرتے تھے اور لوگ بھی آرام سے آتے جاتے تھے۔ راہ چلنے والوں کے لئے ہم کوئی خطرہ نہ تھے، لیکن اب ہمارے لئے راہ چلنے والے رُوحانی کوفت کا باعث بن گئے تھے، خصوصیت کے ساتھ محلّے کے بچّے۔ ہم جیسے ہی گلی میں اپنی موٹر سائیکل لے کر نکلتے، محلّے کے بچّے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے کہتے: "آؤ یارو! موٹر سائیکل کے ساتھ دوڑ لگاتے ہیں"۔ چنانچہ دوڑ لگائی جاتی اور ہمیشہ اس دوڑ میں لڑکے بالے ہماری موٹر سائیکل سے آگے نکل جاتے۔ ہمارے پاس خون کے سے گھونٹ پی کر چُپ ہو رہنے کے سوا اور کوئی علاج نہ تھا۔

محلّے میں موٹر سائیکل چلانے کی مشق اچھی طرح کرنے کے بعد ہم نے سوچا اب اسے بازار میں لایا جائے۔ بازار میں لے کر چلے تو ہم نے محسوس کیا یا تو ہماری موٹر سائیکل دیکھنے کے لئے یا پھر ہمیں تنگ کرنے کی غرض سے لوگ بازار میں بلا وجہ نکل آئے ہیں اور معمول سے زیادہ ہی بھیڑ ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنے برخوردار سے جو اس وقت ہمارے پیچھے بیٹھا تھا پُوچھا: "کیوں میاں کیا آج بازار میں کچھ زیادہ رش ہو گیا ہے؟"

"ابا جان ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر یہ کیا سبب ہے کہ سامنے سے رکشا بھی آ رہا ہے کاریں بھی آ رہی ہیں۔ سائیکل والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ پیدل چلنے والے بھی بہت ہیں۔ اسے رش نہیں کہتے تو پھر کسے ..... بُھوں ... گھاں ... ٹھُس۔ پتہ چلا کہ باتیں کرنے کی وجہ سے ہم ریس دینا بھول گئے اور گاڑی کھانستی ہوئی اور ایک دو ٹھمکے لگاتی ہوئی ٹھہر گئی۔ ہمارے ٹھہرنے کے ساتھ ہی موٹروں، ٹیکسیوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کے ہارن کی وجہ سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پی۔ پاں۔ پوں۔ کوں۔ گھی۔ گھی اور ساتھ ہی سامنے سے جو ایک سائیکل سوار آ رہا تھا ہم سے اس طرح بغلگیر ہو گیا جیسے نہ معلوم کتنے دنوں کا بچھڑا ہوا تھا۔ سائیکل والے سے بمشکل جان چھڑائی اور پیدل ہو کر موٹر سائیکل کو ایک طرف لے گئے۔ ٹریفک دوبارہ اپنے معمول پر آئی تو ہم نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ پہلے گیئر پر چلتے چلتے دیر ہو گئی تو برخوردار نے کہا: "آپ دوسرا گیئر کیوں نہیں لگاتے اس طرح تو انجن بھی گرم ہو جائے گا اور اُسے نقصان بھی پہنچے گا۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں کہ سامنے سے ٹریفک آنا بند ہو تو میں دوسرا گیئر لگاؤں۔"

"ابا جان! معاف کیجئے۔ ٹریفک تو شاید رات کے بارہ بجے بھی نہ رُکے۔ کیا آپ پہلے گیئر ہی میں گاڑی چلاتے رہیں گے؟"

"یعنی برخوردار تم ہم سے مذاق کر رہے ہو؟" ہم نے قدرے ناراض ہو کر پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے آپ کم از کم دوسرا گیئر تو لگا لیجئے اس میں زیادہ دقت پیش نہ آئے گی۔"

ہم نے دانت بھینچ کر دوسرا گیئر لگایا تو واقعی آسانی سے لگ گیا، لیکن ہمارے ماتھے پر پسینے کے آثار نمودار ہو گئے اور دل بھی کچھ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہم دوسرے گیئر پر چلے جا

رہے تھے، لیکن ہم نے دیکھا کہ موٹر کاروں اور رکشاؤں کے علاوہ سائیکل والے بھی ہم سے آگے نکلے جا رہے ہیں۔ سائیکل والوں پر خاص طور سے غصہ آیا کہ ان کی یہ مجال ہمارے برابر سے گزر جائیں اور ہمیں پیچھے چھوڑ جائیں۔ ہم سائیکل سواروں پر غصہ کھانے میں مصروف تھے کہ ایک دو تانگے بھی ہمارے برابر سے گزر گئے اور ایک تانگے کی ڈھٹائی پر تو ہمارا جی بہت ہی جلا کہ کم بخت کسی صورت میں ہمیں آگے نہیں نکلنے دیتا تھا۔ ہم نے برخوردار سے پُوچھا کہ یہ کیا راز ہے۔ سب سواریاں ہم سے آگے کیوں چلی جا رہی ہیں؟ برخوردار نے جواب دیا: "اس لئے کہ وہ ہم سے تیز چل رہی ہیں۔"

"یعنی تانگے اور سائیکلیں بھی ہماری موٹر سائیکل سے تیز چل رہی ہیں؟" ہم نے تڑپ کر دریافت کیا اور برخوردار نے ہمارے اس بے تابانہ سوال کا نہایت آہستگی سے جواب دیتے ہوئے فرمایا: "ابا جان! آپ خود ہی غور فرمائیے اگر یہ سواریاں ہم سے تیز نہیں چل رہی ہیں تو پھر کیونکر ہم سے آگے نکل سکتی ہیں۔"

برخوردار کے اس سوال نے ہمارے دل میں جذبۂ غیرت کو بیدار کیا تو ہم نے بھی دل ہی دل میں نعرۂ حیدری بلند کیا اور گاڑی کو ریس دی۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ہم ذرا سی دیر میں کئی سائیکل سواروں اور تانگوں سے آگے نکل گئے۔ دِل میں عجیب قسم کا احساسِ فخر پیدا ہُوا جس کے نتیجے میں ہم نے اپنی گردن کو اُونچا کرنا ہی چاہا تھا کہ برابر سے ایک رکشا گھوں گھوں کرتا نکل گیا۔ رکشا تو بخیر و عافیت نکل گیا، لیکن ہم اپنا توازن کھو بیٹھے۔ برخوردار نے پیچھے سے آواز لگائی: "ابا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

ہم نے پھر پدرانہ غصے میں جواب دیا: "کیا کرتا؟ ڈگمگا رہا۔" دل اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے مجھ سے پُوچھ رہے ہو کیا کر رہا ہوں ... حالانکہ ... حالانکہ ..."

"یہ سب کچھ میرا قصور ہے۔" برخوردار نے جملہ پُورا کیا۔

"جی ہاں یہ سب کچھ تمہارا ہی قصور ہے۔ آخر تم میرے پیچھے بیٹھے کس لئے ہو؟ تم نے اس رکشے کو برابر سے گزرنے ہی کیوں دیا؟" بہر حال ہم بمشکل تمام گرتے گرتے بچے اور حسبِ معمول موٹر سائیکل کو ایک طرف ٹھہرا کر دوبارہ اسٹارٹ کیا۔ ہم چلنے لگے، لیکن برخوردار کو دیکھا کہ وہ کھڑا

ہے۔ ”ارے بھئی تم پیچھے کیوں نہیں بیٹھتے؟“

”جناب بُرا نہ مانیے میں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کو روکنا میرے بس کی بات نہیں۔“

”میاں تم بھی بڑے احمق ہو۔ میں نے وہ بات صرف اسی وقت کے لئے کہی تھی۔“ برخوردار پیچھے بیٹھ گیا اور ہم نے پہلے گیئر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا جلدی جلدی لگا ڈالا۔ گاڑی ٹھیک چل رہی تھی۔ رفتار بھی بیس میل فی گھنٹہ کے حساب سے کچھ کم نہ تھی۔ ہمیں پہلی مرتبہ کچھ لطف سا آنے لگا، مگر کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا ہے۔ فوراً گھبرا کر برخوردار سے پوچھا ”اب کیا کرنا چاہیئے؟“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”دیکھتے نہیں ہو سامنے سے ٹرک آ رہا ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگر یہ ہم پر چڑھ گیا تو۔ . . .؟“

”ایسا کیوں ہوگا؟“ ٹرک اور نزدیک آ گیا۔

”جلدی بتاؤ کیا کروں؟“ ہم نے بڑبڑا کر پوچھا۔

”کچھ بھی مت کیجئے آرام سے اپنی سمت رہیئے۔ یہ خود بخود گزر جائے گا۔“ ٹرک برابر سے گزر گیا۔ لیکن یقین کیجئے ہمیں یوں لگا جیسے اوّل تو ہمارے اُوپر سے گزرا ہے اور اگر ایسا نہیں ہُوا تو ہم سے ٹکرا کر ضرور گیا ہے۔ بڑی مشکل سے ہوش ٹھکانے آئے، مگر ہم پھر سڑک کے کنارے گاڑی روکے کھڑے تھے۔ برخوردار نے کہا: ابا جان! اس طرح کیونکر کام چلے گا۔ ہمیں گھر سے نکلے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے، لیکن ابھی تک دو میل بھی طے نہیں کر سکے۔ بہتر یہ ہے کہ یہیں سے واپس ہو جائیں۔“ ہمیں شرمندگی کے بجائے یوں لگا جیسے برخوردار نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے جو اس وقت گھر چلنے کو کہا ہے۔ ہم نے وہیں سے گاڑی کا رُخ گھر کی جانب موڑ دیا۔ واپس آتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ ہم کچھ زیادہ وثوق اور عمدگی سے موٹر سائیکل چلا رہے ہیں۔ گویا جس طرح گھوڑا یا بیل اپنے تھان کی طرف آتے ہوئے جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہے ہم بھی

اسی طرح اپنے تھان یعنی گھر کو لوٹ رہے تھے۔

اگلے روز ہم نے پھر صبح صبح مشق کے لئے گاڑی نکالی۔ پہلے سوچا تنہا گاڑی چلائی جائے پھر خیال آیا اُستاد کو پیچھے بٹھانا ضروری ہے؛ چنانچہ برخوردار کو ساتھ لیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہمارے پاؤں کے معمولی اشارے سے گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ پہلا گیئر بھی کھٹ سے لگ گیا۔ اُچھلے یا چھلانگ لگائے بغیر گاڑی شائستگی کے ساتھ چل بھی پڑی۔ اسی طرح ذرا دُور چل کر ہم نے آسانی کے ساتھ دوسرا گیئر بھی لگا لیا اور اب ہم خوشی کے مارے تیسرا گیئر لگانے والے تھے کہ ہم نے سامنے سے دیکھا ایک موٹر سائیکل آرہی ہے۔ ہم ایک دم ڈولنے لگے۔ برخوردار نے ہمت بڑھائی اور کہا "گھبرائیے نہیں، موٹر سائیکل ہم سے ابھی بہت دُور ہے"۔

"دُور کہاں ہے وہ تو آگے بڑھتی چلی آرہا ہے"۔ اس فقرے کے ساتھ ہی ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں چلی آرہی ہے"؟ ہمارے اس گھبراہٹ سے لبریز سوال پر برخوردار بولا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کیوں چلی آرہی ہے"۔

"اچھا تمہیں بھی معلوم نہیں کیوں چلی آرہی ہے"۔ یہ کہہ کر ہم پھر ڈگمگانے لگے۔ گویا برخوردار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرکے ہم پر یہ واضح کیا ہے کہ کوئی ایسی بلا آرہی ہے جس کا اس کے پاس بھی کوئی علاج نہیں؛ چنانچہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں۔ اِدھر موٹر سائیکل قریب آتی جارہی تھی . . . اور . . . اور . . . آخر ہم نے اپنی موٹر سائیکل اس موٹر سائیکل سے ٹکرا دی۔ اگرچہ اس حادثے میں فریقین میں سے کسی کے ذرا چوٹ نہیں آئی اور دونوں گاڑیاں بھی صحیح سلامت رہیں لیکن اپنی جگہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے معذرت طلب کررہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ دوسرے صاحب بھی ہماری طرح صبح صبح موٹر سائیکل سیکھنے کی مشق فرمانے کے لئے گھر سے نکلے تھے۔ ان کا خیال تھا انھوں نے ہماری موٹر سائیکل میں ٹکر ماری ہے اور اِدھر ہم اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ برخوردار نے بتایا قصور دونوں کا تھا۔ ہم بھی اپنی موٹر سائیکل کو بچانے کی خاطر اُن کی موٹر سائیکل سے ٹکرانے کی کوشش میں مصروف تھے اور یہی حال دوسرے

موٹر سائیکل والے صاحب کا تھا۔ اس حادثے سے ہم پر یہ راز منکشف ہوا کہ ابتدا میں ہم جس چیز سے اپنی گاڑی کو بچانا چاہتے ہیں اسی سے انجانے طور پر اس کو ٹکرا دیتے ہیں ــ اس کا تجربہ ہمیں بعد میں بھی کئی بار ہوا۔ مثلاً ہم آرام سے اپنی گاڑی پر چلے آرہے ہیں سامنے سے کوئی سائیکل والا یا پیدل آتا دکھائی دیا سوچا فوراً خود کو مع اپنی گاڑی اس سے بچایا جائے، مگر ہوا یہ کہ اسی سے ٹکرا گئے۔ اب وہ بے چارہ ہزار "ہیں ... ہیں ... ار ... ار ..." کہے چلے جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس سے ٹکرائے بغیر باز نہیں آرہے۔ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ اس تصادم میں کبھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ غالباً اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری گاڑی کی رفتار ایسے موقعوں پر ایک "دو" میل فی گھنٹہ سے کبھی زیادہ نہ ہوئی۔

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا ہے اگرچہ موٹر سائیکلوں کے ٹکرانے سے کوئی چوٹ نہ آئی تھی، لیکن ہمارا موڈ ضرور خراب ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہم بڑی سڑک پر آ گئے، لیکن اُس پر آتے ہی ہم نے گاڑی روک لی۔ برخوردار بولا: "ابا جان! گاڑی چلاتے کیوں نہیں؟"

"ارے میاں دیکھتے نہیں سامنے سے کار آرہی ہے۔"

"وہ تو بہت دُور ہے کوئی دو سو تین سو گز دُور۔"

"پھر کیا ہُوا۔ یہ فاصلہ ایک کار کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا،" ہم نے فوراً جواب دیا۔ چند لمحوں بعد وہ کار گزر گئی، لیکن ہم پھر بھی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ برخوردار نے کہا: "ابا جان اب گاڑی چلائیے نا۔"

ہم نے کہا: "اُستاد! ہمارے سفر کی ابتدا کچھ ٹھیک نہیں ہوئی۔ بہتر ہے کہ یہیں سے گھر لوٹ چلیں۔"

اسی طرح ہم کئی روز برخوردار کو ساتھ بٹھا کر موٹر سائیکل چلانے کی مشق کرتے رہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ جیسے ہی کسی موقع پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہم پیچھے آجاتے اور برخوردار گاڑی چلانے لگتا۔ جونہی بھیڑ کم ہوتی ہم پھر آگے آجاتے، لیکن اس آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے کئی بار عجیب عجیب قسم کے لطیفے سرزد ہو گئے۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ ہم نے دیکھا کہ ہماری موٹر سائیکل ایک باریش بزرگ پر چڑھے چلی جا رہی ہے اور رُکنے میں نہیں آتی۔ ہم نے اپنے برخوردار سے چلا کر کہا:

"قبلہ اُستاد صاحب! یہ موٹر سائیکل رُکتی کیوں نہیں؟"

"رُکے گی تو اس وقت جب آپ اسے روکیں گے۔"

"یعنی مَیں روکوں گا؟"

"جی ہاں آپ۔"

"وہ کیسے؟"

"بریک لگا کر۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ مولانا اُچھل کر ہماری گود میں آ بیٹھے۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ گاڑی ہمارے برخوردار نہیں، بلکہ ہم چلا رہے تھے۔ ہم نے غصّے میں آ کر کہا: "ارے لڑکے تم نے ہمیں یہ بھی نہ بتایا کہ اس وقت گاڑی کون چلا رہا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا تم گاڑی چلا رہے ہو۔" ادھر مولانا ہم سے الگ خفا تھے اور کہے چلے جا رہے تھے "میاں! ہمیں کچلنے کا پروگرام تھا۔ وہ تو یہ کہو کہ لڑکپن میں چھلانگ لگا کر گھوڑے پر چڑھنے کی مشق کی تھی ورنہ اس وقت ہم تمہاری پھٹ پھٹی کے نیچے دم توڑ رہے ہوتے۔"

ایک بار یُوں ہوا کہ موٹر سائیکل تیز چلی جا رہی تھی۔ سڑک پر کوئی ٹریفک بھی نہ تھی۔ ہم نے بڑے فخر کے ساتھ بیٹے کو مخاطب کیا؛ "دیکھو میاں! گاڑی اس طرح چلائی جاتی ہے۔" بیٹے نے جواب دیا؛ "آپ نے دُرست فرمایا، لیکن ابّا جان! اس وقت تو مَیں گاڑی چلا رہا ہوں۔"

ہم یہ جواب سُن کر خاموش ہونے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟ آخر ہم نے ایک دن فیصلہ کیا کہ برخوردار کو ساتھ بٹھانا کوئی اچھی بات نہیں، کیونکہ ہمیں اکثر یہ احساس نہ رہتا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو آگے سمجھ لیتے؛ حالانکہ اس وقت پیچھے ہوتے۔ کبھی پیچھے سمجھ لیتے؛ حالانکہ اس وقت ہم پُوری طرح آگے ہوتے یعنی گاڑی چلا رہے ہوتے تھے۔ کسی موڑ پر ہمیں گاڑی موڑنا ہوتی، لیکن برخوردار سے کہتے: "یار گاڑی موڑتے کیوں نہیں؟" کبھی ایسا ہوتا کہ ہم سیدھے چلنا چاہتے، لیکن گاڑی دائیں یا بائیں کو مُڑ جاتی اور جب ہم پُوچھتے کہ ہمیں تو سیدھے جانا تھا گاڑی مُڑ کیسے گئی تو برخوردار جھنجھلا کر جواب دیتا۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

اس پر اظہارِ تاسف اور تعجب کے ساتھ ہم کہتے "او ہو! برخوردار تم گاڑی چلا رہے ہو میں سمجھا تھا میں چلا رہا ہوں"۔

غرض پانچ چھ مہینے کی مسلسل کوشش کے بعد ہم نے اپنے آپ کو اس قابل بنا لیا کہ گھر سے کالج اور کالج سے گھر آجا سکیں۔ گھر سے کالج تک چار بڑے سخت مقام آتے ہیں جہاں سے بے فکری کے ساتھ گزرنا ہمارے لئے آج بھی کوئی سہل کام نہیں۔ پہلا مقام چوبرجی، دوسرا ایم اے او کالج کے سامنے کا گول چکر، تیسرا بھنگیوں کی توپ اور چوتھا خود کالج کا گیٹ ــــ دو سخت مقام تو خود چوبرجی پر آتے ہیں۔ ایک تو پونچھ روڈ سے ملتان روڈ پر آنا اور دوسرے ملتان روڈ سے ملتان روڈ پر ہونا مطلب یہ کہ پہلے تو پونچھ روڈ سے ملتان روڈ پر آنے کے لئے دائیں بائیں اچھی طرح دیکھنا ہوتا ہے اور جب یہ مرحلہ بخیر و عافیت گزر جاتا ہے تو پھر ذرا آگے چل کر ملتان روڈ سے لیک روڈ نکلتی ہے اب چونکہ یہاں اکثر ٹریفک کا ہجوم رہتا ہے، اس لئے ملتان روڈ پر قائم رہنا بھی ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہم آج بھی جب کہ ہمیں موٹر سائیکل چلاتے قریباً ایک سال گزر چکا ہے۔ پونچھ روڈ سے ملتان روڈ پر آتے ہوئے پانچ چھ منٹ اور کبھی کبھی آدھ گھنٹہ صرف کر دیتے ہیں۔ بہرحال جب گھر سے کالج اور کالج سے گھر آتے ہوئے ہمیں ایک آدھ مہینہ گزر گیا، تو ہم سمجھے اب ہمیں گاڑی چلانا آگئی ہے؛ چنانچہ شومیٔ قسمت سے ایک دن مال روڈ پر نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ محسوس کیا ہم کسی اجنبی راستے پر چلے آئے ہیں۔ دل کو بہت سمجھایا کہ میاں گھبراؤ نہیں یہ وہی مال روڈ ہے جس پر خدا جھوٹ نہ بلوائے لاکھوں بار چلے ہوں گے، مگر توبہ کیجئے صاحب دل یہی کہہ رہا تھا۔ "ظالم تو نے ہمیں مروا ڈالا"۔ ہم کچھ اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ٹولنٹن مارکیٹ کا چوراہا آ گیا۔ اور بتی بھی سرخ ہو گئی یعنی راستہ بند۔ ہم نے فوراً گاڑی کو ٹھہرایا اور جلدی جلدی گھبراہٹ کے ساتھ گیئر بدلے۔ سرخ سے سبز بتی ہوئی۔ اب ہم چلنے لگے تو گاڑی بند۔ پیچھے تمام ٹریفک نے چیخنا شروع کر دیا۔ ہم ایک طرف کو ہوئے۔ دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی، لیکن جیسے ہی چلنے لگے اتنے میں پھر سبز سے سرخ بتی ہو گئی۔ ہم پر دوبارہ گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ سبز بتی کے ہوتے ہی ہم نے چلنا شروع کر دیا۔ خدا کا شکر کہ ہم چل پڑے، لیکن چند قدم کے بعد ہی نیلا گنبد کا چوراہا

آگیا اور یہاں پھر سُرخ بتی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے سامنے ٹریفک کا سپاہی بھی کھڑا تھا۔ ہم نے اِسے ہزار اشارے سے یہ کہا کہ سامنے سے ہٹ جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری گاڑی تم پر حملہ آور ہو جائے، لیکن وہ عقل کا پورا ہمارے اشارے کو قطعی نہ سمجھا۔ اصل میں اُسے سمجھنا بھی نہ چاہیئے تھا۔ بھلا ٹریفک کا سپاہی یہ کب سوچ سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی موٹر سائیکل اس پر چڑھا دے گا۔ یقین کیجئے ہمارا ارادہ بھی کچھ اس طرح کا نہ تھا، لیکن جیسے ہی سبز بتی ہوئی اور ہم نے گھبرا کر کلچ چھوڑا ہے، تو ایک دم ہماری موٹر سائیکل اُچھل کر سپاہی کی طرف بڑھی۔ سپاہی کی اور ہماری قسمت کچھ اچھی ہی تھی کہ کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم نے فوراً دوسرے گیئر سے تیسرا گیئر لگا کر گاڑی کو تیز کر دیا۔ ہمارے پیچھے سپاہی کی سیٹی کی دو چار آوازیں ضرور آئیں، لیکن ہم نے یہی خیال کیا یہ سیٹیاں ہمارے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہیں۔ اس حادثے کے بعد ہم میں آگے مال روڈ پر جانے کی ہمت نہ رہی؛ چنانچہ وائی ایم سی اے ہال کے اخیر سے ہی نیلا گنبد کی طرف مُڑ گئے۔

اس حادثے یا واقعے سے ہم نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ تا حال ہمیں موٹر سائیکل چلانا نہیں آیا، کیونکہ اصل چلانا اسٹارٹ کرنا اور پھر کلچ چھوڑنا ہے جس میں ہم ابھی تک طاق نہیں ہوئے۔ دوسرا نتیجہ ہم نے یہ اخذ کیا کہ جس طرح سواری کے جانوروں مثلاً گھوڑا، بیل اور گدھا وغیرہ کے پاؤں کو ایک رستہ لگ جاتا ہے، اسی طرح کم از کم ہمارے پاؤں کو بھی صرف ایک راستہ لگا ہے، یعنی گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ کسی دوسرے راستے پر چلتے ہیں تو خواہ مخواہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھُول جاتے ہیں، مگر یہ بھی ہمارا خیالِ خام ہی ثابت ہُوا۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر والا راستہ بھی اس وقت تک ہمارے لئے جانا پہچانا ہے جب تک اس راستے پر کوئی خلافِ معمول واقعہ ظہور میں نہ آئے اور یہ خلافِ معمول کی بات بھی خاص ہماری ذات سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک مثال سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ ہماری نظر میں سب سے پہلا عظیم حادثہ جو ہمارے ساتھ پیش آیا وہ کچھ اس طرح تھا کہ ہم نہایت اطمینان کے ساتھ چوبرجی کے مرحلے سے گزر کر یونیورسٹی گراؤنڈ کے برابر سے چلے جا رہے تھے کہ ایک ٹیکسی سامنے پچاس گز کے فاصلے سے ہماری ہی طرف سے، یعنی بائیں طرف سے نکل کر دائیں طرف کو ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا ہمارے ہاتھ پاؤں پھُول گئے اور ہم پکی سڑک سے کچی سڑک پر آ گئے اور دھڑام سے

گر پڑے۔ کچی میں آنے کی وجہ سے خوب دھول بھی اُڑی اور اڑتی ہی رہی، کیونکہ ہم نے موٹر سائیکل کو چلتا چھوڑ کر اس پر سے چھلانگ لگا ڈالی تھی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ہمیں کوئی چوٹ بھی نہیں آئی، صرف ہماری پتلون ذرا سی پھٹ گئی۔ جیسے ہی ہمیں ہوش آیا یا یوں کہہ لیجئے جیسے ہی ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ ہم سے ہمدردی کرنے کے بجائے کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ ہم نے مُسکرانے کی وجہ پُوچھی تو کہنے لگے: "صاحب آپ نے جس انداز سے موٹر سائیکل پر سے چھلانگ لگائی ہے وہ کچھ بہت ہی انوکھا، نرالا اور پُر لطف تھا۔" ان سب تماشائیوں کے علاوہ ٹیکسی والا بھی کھڑا تھا اور ہم سے دریافت کر رہا تھا "بابو جی میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے موٹر سائیکل پر سے کیوں چھلانگ لگائی؟" ہم اس وقت اسے یہی جواب دے سکے کہ میاں کبھی کبھی آدمی کی طبیعت خواہ مخواہ بھی چھلانگ لگانے کے لئے مچل جاتی ہے۔ بس یُوں سمجھ لو اس وقت ہم پر وہی مچلنے کا وقت وارد ہو گیا تھا، حالانکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ٹیکسی کا بائیں طرف سے دائیں طرف کو آنا ہمارے لئے خلافِ معمول واقعہ تھا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم چل رہے ہوں تو کسی کو بائیں سے دائیں آنے کی جُرأت نہیں کرنا چاہیئے، یعنی ہمارا راستہ نہیں کاٹنا چاہیئے۔

آج تک ہم تین چار حادثوں سے دوچار ہوئے ہیں یا یُوں کہہ لیجئے کہ ہم نے خود حادثوں کو دوچار ہونے کی دعوت دی ہے، لیکن یہ تمام حادثے اس وقت پیش آئے جب ہماری موٹر سائیکل کی رفتار زیادہ سے زیادہ چار میل فی گھنٹہ ورنہ ایک آدھ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہ تھی، لہٰذا ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ تیز رفتاری کے سبب کس طرح حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم جب بھی تیز چلتے ہیں تو زیادہ وثوق کے ساتھ چلتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا یقین آہستہ روی میں ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ اپنے چھوٹے بچوں کو پیچھے بٹھا کر سیر کرانے کے لئے گھر سے نکلے۔ اگرچہ ہماری کالونی کو بنے پُورے دس سال ہونے کو آئے ہیں، لیکن کارپوریشن نے تاحال اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اس لئے اس کی سڑکیں پُختہ نہیں: چنانچہ ہم اپنے گھر کے سامنے سے تو بخیر و عافیت بچوں کو لے کر گزر گئے، لیکن جس وقت ظفر صاحب انجینئر کارپوریشن کے گھر کے سامنے آئے تو وہاں ان کا آدمی چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ ہمیں فوراً

خدشہ ہُوا کہیں ہم پھسل نہ جائیں، مگر دل کو سمجھایا آخر اتنی بھی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ پہلے گیئر پر چلے جا رہے ہیں، جب چاہیں گے بریک لگا لیں گے۔ لیکن ہم اپنے ذہن میں یہ حفاظتی بند باندھ ہی رہے تھے کہ گاڑی پھسل گئی۔ ہم نے تو خیر اپنی ٹانگوں سے کام لیتے ہوئے خود کو سنبھال لیا، مگر بچے گاڑی کے نیچے آ گئے۔ اِدھر ہم سے کسی طرح بھی گاڑی بند نہیں ہو رہی تھی۔ پچھلا پہیہ باقاعدہ گھوم رہا تھا۔ بہرحال جُوں توُں کر کے گاڑی بند کی اور بچوں کو بھی اس کے نیچے سے نکالا یا یُوں کہہ لیجئے بچے خود ہی لوٹ پیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

اسی طرح ایک دفعہ ہم کالج کے گیٹ سے سڑک پار کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ غالباً ایک میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کہ اچانک چھوٹے سے بجری کے ڈھیر کے قریب سے جو ہماری گاڑی گزری تو دھڑام سے گر پڑی۔ ظاہر ہے کہ ہم بھی گر پڑے۔ ہمارے طالب علم ہم سے ہمدردی کرنے کے بجائے سوالات کر رہے تھے "سر! یہ بتایئے کہ آپ گر کیسے پڑے؟" کوئی کہہ رہا تھا "سر نہیں گرے، بلکہ گاڑی گری ہے۔ مگر یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ پہلے کون گرا۔ کیونکہ مَیں نے سر کو پہلے گرتے دیکھا گاڑی تو بعد میں گری، غالباً وہ بھی سر کی تقلید میں"۔ کسی نے کہا "میرے خیال میں نہ گاڑی گری ہے نہ سر گرے ہیں، بلکہ سر نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ گاڑی گرے نہ سوار، لیکن حادثہ پھر بھی وقوع میں آسکتا ہے"۔ تیسرا بولا "یہ کیا بات ہوئی عام طور پر تو حادثہ اس طرح وقوع میں آتا ہے کہ گاڑی اور سوار سلامت رہتے ہیں۔ مگر مرتا ہے کوئی تیسرا آدمی۔ لہٰذا سر نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ یہ سب ہماری اپنی آنکھوں کا دھوکہ ہے۔ نہ سر گرے، نہ گاڑی گری اور نہ کوئی حادثہ وقوع میں آیا ہے۔

ہمارے مشہور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ وہ اپنے دوست کی کار میں بیٹھے جا رہے تھے کہ موصوف نے ہمیں موٹر سائیکل پر آتے دیکھا۔ وہ علیک سلیک کرنا چاہتے تھے، لیکن ہم ان کے قریب آئے تو موصوف نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس وقت وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے تو ہم کسی حیل و حجت کے بغیر دھڑام سے زمین پر آ گرتے اور حقیقت بھی یہی ہے ابھی تک ہم میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہُوا کہ موٹر سائیکل پر بیٹھے کسی کے سلام کا جواب دے سکیں یا خود سلام کر

سکیں۔ ہمارے ایک عزیز کے قول کے مطابق ہم جس قدر حضوریٔ قلب کے ساتھ خشوع و خضوع سے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہیں اس طرح شاید ہی کوئی عبادت گزار اللہ کے حضور میں حاضر ہوتا ہوگا۔ کئی بار جی چاہا کہ کسی ملنے والے کو گاڑی پر بیٹھے بیٹھے ہی سلام سے نواز دیا جائے، لیکن ہم نے جب بھی ایسا ارادہ کیا یا تو کوئی چھوٹا موٹا حادثہ پیش آگیا یا ہمارے چہرے پر نرمی اور نیازمندی کے بجائے ایسی کرختگی اور خشونت اُبھر آئی کہ ہمارا مخاطب ہم سے خوفزدہ ہوکر ناراض ہوگیا۔ ایک دفعہ ہمارے ایک بزرگ عزیز کراچی سے لاہور آئے اور خصوصیت کے ساتھ ہم سے ملنے کے لئے ہمارے گھر تشریف لائے۔ سوئے اتفاق سے اس وقت ہم گھر سے موٹر سائیکل پر نکل پڑے تھے، لیکن ابھی خاص دُور نہیں گئے تھے۔ خدا شاہد ہے، ہمارے دل نے بڑے خلوص کے ساتھ یہ چاہا کہ ہم ٹھہر جائیں اور موصوف سے باقاعدہ بغلگیر ہوں، لیکن ٹھہرنے کے بجائے ہم سے گاڑی تیز ہوگئی۔ اِدھر ہم انہیں جھک کر سلام کرنا چاہتے تھے، لیکن ہماری گردن کے ساتھ بھی معاملہ برعکس ہُوا، یعنی وہ خم کھانے کے بجائے اکڑ گئی۔ یہ بزرگ ہمیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور وہیں سے یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے "میں ایسے بداخلاق اور بدتمیز کے گھر ہرگز قدم نہ رکھوں گا جو معمولی سی موٹر سائیکل خرید کر فرعون بن بیٹھا ہے۔"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ سُن لیجیے۔ لوگ تو ہمیں کہتے ہیں کہ ہم موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ناک کی سیدھ میں صرف زمین کو دیکھتے ہیں اور اِدھر اُدھر قطعی نگاہ نہیں ڈالتے، لیکن ہمارے احمد ندیم قاسمی صاحب پیدل ہوکر بھی اس طرح چلتے ہیں کہ مجال ہے جو نظر سامنے سے ذرا اِدھر اُدھر ہوجائے؛ چنانچہ اس کے نتیجے میں اکثر ایسا ہُوا کہ ہم نے انہیں سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا اور پھر اس ہاتھ سے اپنا سر ہی کھُجا کر رہ گئے گویا قاسمی صاحب کو سلام کرنے کے لئے صرف ہاتھ کا اشارہ کافی نہیں، بلکہ چلا کر یہ کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ قاسمی صاحب سلام عرض کرتا ہوں۔ ایک دن ہم اپنی موٹر سائیکل پر قدرے اطمینان کے ساتھ چلے آرہے تھے کہ سامنے سے ہم نے قاسمی صاحب کو آتے دیکھا۔ قریب آئے تو ہم نے سلام کے لئے ہاتھ بھی اُٹھایا۔ اس ہاتھ اُٹھانے میں ہماری گاڑی نے ایک جھول بھی کھایا، لیکن قاسمی صاحب نے حسبِ معمول کوئی جواب نہ دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ ہماری موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ

ضرور قاسمی صاحب کو متوجہ کر سکے گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ اِدھر گاڑی ٹھہرانے کی ہمت ہم میں بھی نہ تھی؛ چنانچہ اپنا سا مُنہ لے کر گزر گئے۔ شام کو ہم نے قاسمی صاحب سے شکایت کی اور یہ معذرت بھی کی کہ اگر ہم گاڑی ٹھہرانے کے قابل ہوتے تو ضرور ٹھہرا لیتے۔ اس پر موصوف نے ہمیں مشرق کے فلمی کالم نگار عالم علی سیّد کا واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "میاں! آپ اپنی گاڑی کو کہیں نہ کہیں تو حسبِ منشا ٹھہرا لیتے ہوں گے، مگر عالم علی سیّد کی بھی سُنیے۔ یہ حضرت آپ کی طرح ایک موٹر سائیکل خرید کر گھر لائے۔ اس کے بعد اسے اسٹارٹ کیا۔ وہ اسٹارٹ ہو گئی اور یہ چل پڑے۔ کچھ دُور جا کر گول چکر آتا تھا۔ یہ اس کا چکّر لگا کر واپس گھر کو ہوئے، لیکن جس وقت گھر سامنے آیا تو سیّد صاحب کو احساس ہُوا کہ انہیں گاڑی چلانا تو آتا ہے، اِسے ٹھہرانا نہیں آتا؛ لہٰذا گھر کی طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے نکل گئے۔ خوش قسمتی سے آگے بھی ایک گول چکر آتا تھا۔ یہ اس کا طواف کر کے پھر گھر کی طرف ہوئے، لیکن جیسے ہی گھر کے برابر سے گزرے تو باحسرت و یاس گزرتے ہی چلے گئے۔ گاڑی کو ٹھہرانے کی خواہش بس دِل کی دِل ہی میں رہی۔ غرض اس طرح رات گئے تک عالم علی سیّد اپنی موٹر سائیکل پر چکّر لگاتے رہے۔ حتیٰ کہ پٹرول ختم ہو گیا۔"

یہ ماجرا سُن کر ہم نے عرض کیا یہ تو صحیح ہے کہ ہمارے ساتھ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس وقت ہم موٹر سائیکل پر چل پڑتے ہیں تو ہمارا رُکنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اپنی موٹر سائیکل کو روکتے ہوئے ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے پُوری کائنات پر ہم سوار ہیں اور موٹر سائیکل کو بریک نہیں لگا رہے، بلکہ کائنات کے مُنہ میں لگام دے رہے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہُوا ہے کہ کائنات کے مُنہ میں لگام دیتے ہوئے ہم نے اپنے ہی مُنہ میں لگام دے ڈالا۔ مطلب یہ کہ دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ گویا ہماری موٹر سائیکل کا رُکنا تین بڑے حادثات کے رُونما ہونے کے برابر ہے۔ ایک ہماری موٹر سائیکل رُکتی ہے دوسرے ہم رُکتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہماری ٹانگیں آسمان کو چُھو رہی ہوتی ہیں اور تیسرے پوری کائنات جام ہو جاتی ہے۔

ایک دن ہم کالج سے موٹر سائیکل پر سوار ہو رہے تھے کہ ہم نے دیکھا ایک پروفیسر

صاحب بھی اپنی عام سی سائیکل پر سوار ہو رہے ہیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے پروفیسر صاحب زمین پر رینگ رہے ہیں اور ہم عرش پر بیٹھے ہیں۔ بس اس خیال کے آتے ہی ہم نے زور سے لاحول پڑھی اور اپنی موٹر سائیکل کے لات مار کر ایک طرف ہو گئے۔ گویا موٹر سائیکل آدمی میں غرور پیدا کرتی ہے۔ یہ تو شیطانی سواری ہوئی۔ وہ دن سو آج کا دن پھر ہم اس ناہنجار سواری پر کبھی سوار نہیں ہوئے؛ حالانکہ ہم نے نہایت نیک جذبے کے تحت موٹر سائیکل کو خیرباد کہا، لیکن بیگم کا خیال ہے کہ ہم موٹر سائیکل سے ڈرتے ہیں اور خوف کے مارے اس پر سوار نہیں ہوتے۔

قِصّہ ایک کنواری کا

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مجھے محکمۂ انہار میں بھرتی ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ میری نظمیں، غزلیں ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی تھیں اور خود محکمۂ انہار کے اخبار میں بھی میں ادیب اور شاعر کی حیثیت سے خاصا مشہور تھا۔ عملۂ مال کی ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ایسوسی ایشن کے نئے صدر اور سیکرٹری وغیرہ کا انتخاب ہونا تھا کہ اچانک کرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہوئے کلکٹر صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ موصوف نے مجھ سے پوچھے بغیر مائک پر آ کر یکایک اعلان کر دیا: "حضرات! اس سے قبل کہ میں آپ سے نئے عہدے داروں کے انتخاب کے لئے گزارش کروں، اپنے محکمے کی ایک معروف ادبی شخصیت مشکور حسین یاد سے درخواست گزار ہوں کہ موصوف اسٹیج پر تشریف لا کر لیڈر کے خصائص بیان فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ لیڈر کیسا ہونا چاہیئے اور کیسے لیڈر کا انتخاب ہمارے لئے مُفید ثابت ہو سکتا ہے۔"

آپ جانتے ہیں تقریر کرنے کی خواہش قریب قریب ہر پڑھے لکھے شخص کے دِل میں کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اسے اس کا موقع میسر نہ آئے یا موقع ملے تو عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے جائے؛ چنانچہ تقریر کرنے کا شوق میرے دل میں بھی ایک مدت سے کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں، ادیب اور شاعر قسم کے حضرات کے بارے میں عام لوگ یہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں کہ جس طرح یہ حضرات شعر کہہ سکتے ہیں اور مضامین لکھ سکتے ہیں اسی طرح تقریر کرنا بھی اِن کے دائیں ہاتھ کا کام

ہے اور غالباً اِسی خیال کے پیشِ نظر کلکٹر صاحب نے مجھ سے درخواست کی تھی۔ اِدھر میں نے سوچا: "اے مشکور! کب تک خیالی دنیا میں گم رہو گے؟ جب تمہاری یہ دلی خواہش ہے کہ مضمون اور شاعری کے ساتھ تقریر کے فن پر بھی عبور حاصل ہو جائے تو آج تمہیں ایک نہایت سُنہری موقع میسّر آ رہا ہے۔ کچھ سوچے بغیر اور دل میں کسی قسم کا خوف لائے بغیر اللہ کا نام لے کر تقریر کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پیارے! تمہیں معلوم ہے کہ کیسے کیسے جاہل قسم کے لوگ اسٹیج پر آ کر بولنا شروع کر دیتے ہیں، تم تو ماشاءاللہ پھر بھی کچھ پڑھے لکھے آدمی ہو، اہلِ علم وفن کی صحبتیں بھی دیکھی ہیں، ان سے ہمکلام بھی ہوئے ہو، تمہارے لئے جھجک یا گھبراہٹ چہ معنی دارد۔" لہٰذا اِس خیال کے ساتھ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اُٹھ کر اسٹیج پر آ گیا۔

ایک دو مرتبہ کھانسنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر جو اپنے سامنے دیکھا تو سامعین اور حاضرین کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا۔ یوں لگا جیسے میں نے آنکھیں کھولنے میں یقیناً کوئی غلطی کر دی ہے؛ چنانچہ آنکھیں بند کر لیں اور سوچا دوبارہ آنکھیں کھولوں گا تو انشاءاللہ اتنے حاضرین قطعی نظر نہ آئیں گے۔ ویسے بھی مجھے اچھی طرح یاد آ گیا کہ ابھی ایک لمحہ پہلے جب میں خود حاضرین میں شامل تھا تو ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہرگز نہ تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اور گڑبڑ بھی حاضرین کی طرف سے نہیں اپنی آنکھوں کی طرف سے ہوئی ہے جنہیں اس وقت بلاوجہ ایک کے چار چار نظر آ رہے ہیں۔ میں نے زور سے لاحول پڑھی جسے حاضرین یہ سمجھے کہ میں نعرۂ تکبیر لگوا رہا ہوں؛ چنانچہ لاحول کے جواب میں نیچے سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں۔ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے میں نے آنکھیں بھی کھول دیں۔ حاضرین کی تعداد میں تو خیر اب بھی کوئی خاص کمی واقع نہ ہوئی تھی، لیکن میں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ انشاءاللہ ہمّت نہ ہاروں گا، اسٹیج سے اُسی وقت اُتروں گا جب مجھ سے ایک عدد تقریر سرزد ہو چکی ہو گی؛ چنانچہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے میں نے تقریر کا آغاز کر ڈالا۔

"حاضرین حضرات۔۔۔!" یہ دو الفاظ میری زبان سے ضرور نکلے، لیکن فوراً خیال آیا کہ مجھ سے کوئی فحش قسم کی غلطی ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غلطی تو واضح انداز کی یہی نظر آئی کہ میرا حاضرین حضرات کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ حاضرین کے ساتھ تو عام طور پر کرام کا لفظ

آیا کرتا ہے یا اگر حاضرین کے لفظ سے پہلے کوئی لفظ لانا ہو تو وہ معزز کا لفظ ہے، یعنی پھر یوں کہا جاتا ہے، معزز حاضرین، مگر میں نے یہ حاضرین کے ساتھ حضرات کا لفظ کیا لگا ڈالا۔ مجھے اپنی دوسری غلطی یہ لگی کہ صاحبِ صدر کو خطاب کیے بغیر براہِ راست حاضرین کو خطاب کرنا کہاں کا دستور ہے ؟ میرا یہ فعل بھی کوئی عمدہ نہ تھا؛ چنانچہ میں نے سوچا حاضرین کے معاملے پر فی الحال غور کرنا دُرست نہیں۔ انہیں حاضرینِ کرام یا معزز حاضرین کے بجائے "حاضرینِ حضرات" کہہ کر پکار بھی لیا تو یہ ایسی کوئی خاص غلطی نہیں۔ اصل غلطی تو یہ ہے کہ مَیں نے صاحبِ صدر کو نظر انداز کر دیا ہے؛ لہٰذا پہلے اس غلطی کی تلافی کی جائے اور فوراً صاحبِ صدر کی طرف مُنہ کر کے انہیں خطاب کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی میرا مُنہ خود بخود صاحبِ صدر کی جانب مُڑ گیا، لیکن جیسے ہی صاحبِ صدر کو خطاب کرنے لگا، میرا ذہن دوبارہ انہی دو الفاظ "حاضرین حضرات" کی طرف منتقل ہو گیا۔ سوچا، جس طرح حاضرین کو خطاب کرنے میں غلطی ہو گئی اس طرح صاحبِ صدر کو خطاب کرنے میں یقیناً "غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔" اچھا ... اگر یہ بات ہے تو پھر صاحبِ صدر کو کیا کہہ کر خطاب کیا جائے ؟" مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ جناب محترم صدر صاحب ! ... یہ تو بہت پُرانا انداز ہے۔ اس کے علاوہ کچھ طویل بھی ہے۔ سوچا، قبلہ صدر صاحب ! کیسا رہے گا ؟ نہیں نہیں، یہاں قبلہ کا لفظ نہایت غیر موزوں ہے۔ صدر صاحب کے ڈاڑھی تو کیا مونچھیں تک نہیں۔ ایسے شخص کو جس نے مردانگی کی دونوں ہی نشانیوں کا صفایا کر رکھا ہو اُسے قبلہ کہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ پھر کیا کہا جائے ؟ او ہو ! سیدھی طرح صاحبِ صدر کہہ کر کیوں نہیں پکارتے۔ مَیں یہ کہنے ہی والا تھا کہ پھر خیال آیا کہ صاحبِ صدر کے کیا معنی ہوئے۔ صدر کا صاحب، یہ تو کوئی بات نہ بنی، مگر عموماً تقریر کرتے وقت اسی طرح کہا جاتا ہے اور چُونکہ مُدّت سے بڑے بڑے مقرر یہی کہتے آ رہے ہیں، پھر میرے کہنے میں کیا حرج ہے ؟ اسی کشمکش میں کہ آیا "صاحبِ صدر" کی ترکیب لسانی اعتبار سے دُرست ہے یا غلط، مَیں نے کُرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہوئے صاحب کو صاحبِ صدر کہہ کر خطاب کر ہی ڈالا، لیکن کشمکش اور تذبذب کی وجہ سے صاحبِ صدر کے الفاظ زبان سے کچھ اس طرح ادا ہوئے کہ صاحب کا 'صا' الگ ہو گیا اور 'حبِ صدر'

کچھ یوں زبان سے نکلا کہ وہ 'ابے صدر' سُنائی دیا۔ احتیاط کے طور پر صاحبِ صدر کے ساتھ ایک اور صاحب بھی لگا دیا تھا۔ اس طرح سب کچھ رل ملا کر جو زبان سے نکلا وہ یہ تھا: 'ابے صدر صاحب'! میرے اس انوکھے طرزِ تخاطب پر پہلے تو صاحبِ صدر قدرے پریشان ہوئے اور جب میں نے دوبارہ موصوف کو 'ابے صدر صاحب' کہا تو اس دفعہ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب آپ اسے حیرت کی وجہ سے سمجھیں یا غصّے کے باعث، بہرحال صاحبِ صدر کے اس فعل کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی آنکھیں پھٹی نہیں تھیں، بلکہ کُھلی تھیں کہ مجھ ایسے مقرر کو تقریر کی دعوت دے کر انہوں نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ بہرحال ابھی تک معاملہ اس لئے ٹھیک ٹھاک تھا کہ حاضرین کو اس بدحواسی کی پوری طرح خبر نہ ہوئی تھی۔ غالباً وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نے ابے صدر نہیں کہا، بلکہ یہ مائیکروفون کی خرابی ہے جو مسلسل چُوں بھاں، چُوں بھاں کر کے غیب سے میری مدد کر رہا تھا۔

صاحبِ صدر اور حاضرین کو خطاب کرنے کے بعد اب میرے سامنے موضوع کا مسئلہ تھا۔ موضوع بہت واضح تھا یعنی لیڈر کے خصائص؛ چنانچہ میں نے ٹھہر ٹھہر کر نہایت اعتماد کے ساتھ کہنا شروع کیا: "ہاں تو حضرات! آپ . . . کو . . . معلوم ہی ہے . . . میرا . . . موضوع ہے (موضوع کی ع پر زور دیتے ہوئے) لی . . . ڈر . . . کے . . . خصا . . . ئص . . . جی ہاں! لیڈر کے . . . خصائص . . . مسئلہ کیا ہوا؟ لیڈر کے خصائص . . . سُرخی کیا ٹھہری . . . لیڈر کے خصائص میرا مطلب ہے یہ تین ہی الفاظ ہوئے نا۔ "لیڈر" ایک "کے" دو اور "خصائص" تین۔ تو میرے معزز حاضرین حضرات! میں آپ کو آج . . . ! آج کیا! . . . ابھی ابھی . . . بالکل اسی وقت . . . بتاؤں گا کہ . . . لیڈر کے خصائص کیا ہیں؟ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میرے موضوع میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہے۔ اِدھر آپ بھی ماشاء اللہ ہیر پھیر کے آدمی نہیں ہیں . . . بس تو پھر اب بتانے والی بات کیا رہ گئی ہے؟ لیڈر کے خصائص . . . تو حضرات سیدھی سی بات یہ ہے کہ جہاں تک لیڈر کے خصائص کا تعلق ہے وہ تو لیڈر کے خصائص ہیں خالص لیڈر کے خصائص . . . یعنی آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ . . . لیڈر کے خصائص کو کسی اور کے خصائص نہیں کہہ سکتے . . . خصائص تو خصائص رہتے ہیں، اسی طرح لیڈر بھی لیڈر رہتا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی

قطعی ضرورت نہیں۔ لیڈر کو لیڈر رہنے دیجئے اور خصائص کو خصائص۔ اگر لیڈر کو خصائص میں اور خصائص کو لیڈر میں تبدیل کر دیا تو پھر یاد رکھئے آپ کو نہ لیڈر کا کچھ پتہ چلے گا اور نہ اس کے خصائص کا۔"

میں تقریر کئے جا رہا تھا اور حاضرین بُت بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اچانک احساس ہوا جیسے میں تقریر کچھ ٹھیک نہیں کر رہا ہوں... غالباً گھبرا رہا ہوں۔ دِل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "پیارے گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں"، چنانچہ میں جو ذرا کی ذرا رُک گیا تھا، ایک دم سینہ تان کر دوبارہ حاضرین سے مخاطب ہوا: "ہاں تو میرے پیارے حاضرین!" خیال آیا آخر میں نے حاضرین کے ساتھ پیارے کا لفظ کس لئے لگایا۔ یہ خواہ مخواہ کی خوشامد ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے گھبراہٹ کا پتہ چل رہا ہے اور اگر حاضرین پر ایسا ہی پیار آ رہا ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح خطاب کرنے سے ان کے دل میں میرے لئے قطعی کوئی ہمدردی پیدا نہ ہوگی۔ اگر ہمدردی ہی پیدا کرنی ہے تو صاحب صدر کو کہ اس وقت وہ تنہا ہیں، ایسے الفاظ سے خطاب کیا جائے تو غالباً ان پر اچھا اثر پڑے گا۔ مجھے اسوقت اپنا یہ خیال بے حد نیک اور معقول نظر آیا جس کے نتیجے میں فوراً صاحب صدر سے مخاطب ہو کر عرض کیا: "ہاں تو میری جان صاحب صدر!"... لاحول ولا قوۃ۔ صاحب صدر کو میری جان کہنے کی کیا تُک ہوئی۔ چلئے اگر کوئی جواں عمر صدر ہوتا تو شاید اسے میری جان کہنا اتنا غیر مناسب نہ تھا، ساٹھ سال کے بوڑھے کو میری جان کہنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی تانگے میں جُتتے ہوئے سن رسیدہ لاغر گھوڑے کو بچھیرا کہہ کر پکارا جائے۔ اپنی اس غلطی کے احساس کی بنا پر میں صاحب صدر سے معافی مانگنے کے لئے اُن کی طرف رُخ کر کے جھکنے ہی والا تھا کہ مجھے یکایک اپنے چچا اور چچی جان یاد آ گئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، اس وقت چچی کی عمر ساٹھ پینسٹھ اور چچا کی ستر پچھتّر سے کم نہ ہوگی، مگر یہ ایک دوسرے کو آج بھی میری جان، بلکہ ہائے جانی کہہ کر پُکارتے ہیں؛ چنانچہ صاحب صدر کو میری جان کہنا اتنا غیر مناسب بھی نہیں ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ خیال آ رہا تھا ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ یہاں میری جان کے الفاظ میں معنوی خرابی پوری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ پھر کیا کہا جائے؟ اسی کشمکش میں میری نظر

صاحبِ صدر پر پڑی تو انہیں عجیب حال میں بے حس وحرکت سا پایا، لیکن چونکہ صدارت کی کُرسی پر بیٹھے تھے، اس لئے اکڑ بہر حال قائم تھی۔ میرا جی بے ساختہ چاہا کہ صدر صاحب کو "اے بُتِ طنّاز" کہہ کر خطاب کیا جائے۔ زبان سے یہ الفاظ برآمد ہونے ہی والے تھے کہ خود کرُسیٔ صدارت نے ارشاد فرمایا، "مشکور صاحب! سوچ کیا رہے ہیں۔ تقریر شروع کیجئے"۔

"جی ہاں شروع کر رہا ہوں"۔

"شروع کہاں کر رہے ہیں؟ آپ تو دیر سے مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں"۔ صاحبِ صدر کے اس کہنے پر جی چاہا، صاف صاف بتا دوں کہ جناب یہ ضروری نہیں کہ جو شخص مضمون یا شعر لکھ سکتا ہے وہ تقریر بھی کر سکے۔ مجھ سے تقریر وقریر کچھ نہیں ہوتی۔ میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھتا ہوں۔ پھر ایک دم خیال آیا 'اے مشکور! آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟ سوسوا سو کے مجمعے کے سامنے بھی تو تقریر نہیں کر سکتا؟ اور پھر یہ لوگ کون سے ادیب یا شاعر ہیں۔ بے چارے محکمۂ نہر کے ملازم ہیں، یہاں تو جو کچھ بھی کہہ دیا جائے گا وہ اِن کے لئے حرفِ آخر ہوگا' اِس حوصلہ افزا خیال کے ساتھ ہی میں نے پھر سینہ تان لیا۔" ہاں تو حاضرین حضرات"! لاحول ولا قوۃ! یہ میں بار بار حاضرین حضرات کیا کہے چلا جا رہا ہوں"۔ "میرا مطلب ہے معزز حاضرین! تو آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ لیڈر کے خصائص کیا ہوتے ہیں؟ لیڈر... کے... خصائص..."

اب پھر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابتدا کون سی خصوصیت سے کی جائے۔ لیڈر کی مکاری سے... اس کی خود غرضی سے... اس کی نمک حرامی سے... مگر... یہ... یہ خصوصیات تو... غالباً... غالباً کیا یقیناً ایک بُرے لیڈر کی خصوصیات ہیں۔ مجھے تو یہاں ایک مثالی لیڈر کی خصوصیات پیش کرنا ہیں۔ فوراً خیال آیا مثالی لیڈر کی پہلی خصوصیت محبت ہونی چاہیئے، لہٰذا ابتدا اسی خصوصیت کے بیان سے کی جانی ضروری ہے — "ہاں، تو میرے معزز حاضرین! ایک... لی... ڈر کے لئے لازمی ہے کہ وہ حد درجہ عاشق مزاج ہو... لڑکپن سے عاشقانہ مزاج رکھتا ہو تو کیا کہنے"۔ لیڈر کی عاشق مزاجی پر میں ابھی مزید روشنی ڈالنا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا، حاضرین میں سے کچھ حضرات بلاوجہ اپنے دانت نکال رہے ہیں۔ مجھے ایک دم

غصہ آنے لگا اور میں کہنے والا تھا کہ اے حریص دُنیا کے اندھے لوگو! تم کیا جانو کہ عشق کیا چیز ہوتی ہے۔ تمہیں تو بس جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھرنے کی پڑی رہتی ہے، مگر پھر خیال آیا کہ لیڈر کے لیے عاشق مزاج ہونے کی پخ لگانا کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ آخر پھر کیا مناسب ہے؟ میں نے اپنے آپ سے جھنجھلا کر پُوچھا۔ اندر سے جواب آیا، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ صاف صاف کہہ دو کہ مجھے تقریر کرنی نہیں آتی۔ اِس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں؛ چنانچہ میں نے اس بار پکّا ارادہ کر لیا کہ اپنی نا اہلی کا اعتراف کر کے آرام سے اسٹیج پر سے اُتر آؤں گا، مگر جیسے ہی اعتراف کرنے کے لیے حاضرین پر نظر ڈالی سامنے ہی اپنے ایک چپراسی سے آنکھیں چار ہو گئیں جو میری طرف اِس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی بہت بڑی بات کہنے والا ہوں۔ ایکدم حوصلہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ایک اُستاد کا بتایا ہوا یہ گُر بھی یاد آیا کہ جب بھی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو تو یہی سمجھو کہ جس قدر سامعین سامنے بیٹھے ہیں سب کے سب نہایت کودن اور بے وقوف ہیں، بلکہ سیدھی سادی زبان میں سب کو گدھا سمجھو۔

اس خیال کے آتے ہی میں ایک بار پھر اعتماد کے ساتھ کھنکارا اور حاضرین پر بزعمِ خود اپنی عقابی نگاہیں ڈالیں، مگر کیا دیکھتا ہوں کہ حاضرین میں سے اکثر مسکرا رہے ہیں۔ مجھے یکایک غصہ آگیا اور میں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا: "حاضرین! آپ مجھے دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے تقریر کرنی نہیں آتی؟ آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے تقریر کرنا بہت آسان کام ہے۔ مجھے تقریر کرنے کا اصلی گُر بھی اچھی طرح آتا ہے اور آپ پُوچھنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ گُر کیا ہے تو سُن لیجیئے وہ گُر یہ ہے کہ اس وقت میری نظر میں آپ حضرات کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں آپ کو نہایت بے وقوف اور کودن سمجھنے پر مجبور ہوں، بلکہ سچ پُوچھیئے تو ... صاف صاف بتا دوں ..."

کسی نے نیچے سے کہا: "ہاں صاف صاف ضرور بتا دیجئے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔"

"جی ہاں، یہ بات ہے۔"

"تو سُن لیجئے کہ میں اِس وقت آپ سب حضرات کو وہ سمجھ رہا ہوں۔"

"کیا؟" پھر کسی نے پُوچھا۔

"مَیں کہتا ہوں، آپ مجُھے غصّہ نہ دلائیے۔ مَیں جانتا ہوں کہ اِس وقت میرے سامنے آپ سب حضرات کی کیا حیثیت ہے۔"

"آپ ضرور غصّے میں آجائیں اور ہمیں ضرور بتائیں کہ آخر آپ کی نظر میں ہماری حیثیت کیا ہے۔"

"میرے لئے اس وقت آپ سب کے سب گدھے ہیں،" میرے اس پُرخلوص اعلان پر ایک دفعہ تو حاضرین کی جانب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے۔ کچھ حضرات نے لاحول بھی پڑھی، لیکن مَیں نے نہایت حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حضرات! آپ اگر خاموشی کے ساتھ میری تقریر سماعت فرمائیں تو مَیں یہ بھی عرض کروں گا کہ آپ میرے لئے صرف اس وقت تک گدھے ہیں جب تک مَیں تقریر کر رہا ہوں۔ جیسے ہی میری تقریر ختم ہوگی، مَیں آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہوں۔ مَیں کوئی بداخلاق یا بدتمیز آدمی نہیں ہوں۔ یقین کیجئے مَیں دل سے آپ حضرات کی قدر کرتا ہوں، لیکن کیا کروں کہ تقریر کرنے کے اصُول سے مجبور ہوں فی الحال میں آپ کو گدھے ہی سمجھوں گا۔"

اس کے بعد مَیں نے کیا تقریر کی؟ مجُھے کچھ علم نہیں۔ مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب مَیں نہایت زور زور سے صاحبِ صدر کے سامنے رکھّی ہوئی میز پر مُکّے مار رہا تھا اور "لیڈر کے خصائص، لیڈر کے خصائص" کہے جارہا تھا اور صاحبِ صدر مجُھ سے کہہ رہے تھے:

"مشکور صاحب! مجُھ پر تو آپ نے اچھّی طرح واضح کردیا کہ لیڈر کے خصائص کیا ہوتے ہیں، لیکن جوشِ تقریر میں آپ یہ بھُول گئے ہیں کہ حاضرین کی طرف آپ کی پیٹھ ہوگئی ہے اور آپ مُکّے مار مار کر صرف مجھے خطاب فرما رہے ہیں۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو ہال خالی تھا۔ صاحبِ صدر سے عرض کیا، "حاضرین کہاں غائب ہوگئے؟"

جواب ملا: "وہ تو کبھی کے باہر نکل چکے ہیں۔"

تو جناب یہ تھی میری پہلی تقریر جس کو انگریزی زبان میں MAIDEN SPEECH یعنی کنواری تقریر کہتے ہیں اور یوں ہماری کنواری تقریر اسٹیج پر ظہور پذیر ہوئی۔

ہم بھی محفل آرا ہوئے

تونگری بہ دل است نہ بمال۔ آپ جانتے ہیں یہ فارسی کے مشہور شاعر اور ادیب حضرت سعدی شیرازیؒ کا مقولہ ہے جس کا اُردو ترجمہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ تونگری، دِل سے ہے مال سے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دولت مند ہونے کے لئے مال کی ضرورت نہیں، دل کی ضرورت ہے۔ اگر سعدیؒ کے اس مقولے میں ذراسی بھی صداقت ہے، تو مجھے اپنے بارے میں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس خاکسار سے بڑھ کر شاید ہی دُنیا میں کوئی دل کا رئیس ہو— دل کے رئیس کے لئے سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس غریب کے پاس اپنی تونگری کو ثابت کرنے کے واسطے ٹھوس دلائل موجود نہیں ہوتے، مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے پاس اپنے تونگر ہونے کے ٹھوس دلائل بھی موجود ہیں (واضح رہے کہ یہاں ٹھوس دلائل سے میری مُراد سچے واقعات ہیں) میں اگرچہ اپنے طور پر جب بھی موقع میسر آتا ہے اس قسم کے ٹھوس حقائق پیش کرتا رہتا ہوں جو عام طور پر سنگین حقائق میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میرے گھر والوں کا کہنا ہے کہ دولت مندی، دولت ہی سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ دل کا رئیس ہونے والی بات سعدیؒ نے بے خیالی میں یا محض دِل لگی کے طور پر کہہ ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت سعدیؒ، دِل لگی کرنے کی عادت میں بُری طرح مبتلا تھے، لیکن یہ بے خیالی والی بات اپنی سمجھ میں کسی طور نہیں آئی، بہر حال میں اپنے دِل کے رئیس ہونے کا ایک ٹھوس واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہُوں۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے اور اس واقعہ کے سنگین ہونے پر زور نہیں دیں گے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جو شخص دِل کا رئیس ہوا اُس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ محفل آرا بھی ہوتا ہے اور وسیع دستر خوان کا مالک بھی؛ چنانچہ مجھے بھی اپنی زندگی میں سب سے بڑے دو شوق یہی رہے ہیں۔ ایک تو گھر پر طرح طرح کی محفلیں برپا کرنا۔ دوسرے اپنے مہمانوں کو عمدہ سے عمدہ اور لذیذ سے لذیذ کھانے کھلانا۔ میرے یہ دونوں شوق ابھی تک ویسے کے ویسے جوان ہیں۔ ان کے جوان رہنے کی وجہ ظاہر ہے مجھے آج تک اپنے ان ہر دو شوق کو عمل میں لانے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ اِس کا سبب میری طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ میرے گھر والے ان ہر دو شوق کے خلاف ہیں۔ اُن کا خیال ہے "محفل آرائی" سے واقفیت بڑھتی ہے اور واقفیت انسان کو نہ صرف ہونق بنا دیتی ہے، بلکہ مسلسل بناتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دُنیا میں آج تک جتنے فساد برپا ہوئے اُن کی وجہ بھی انسان کی یہ محفل آرائی ہے؛ لٰہذا "خوف فسادِ خلق" سے محفوظ رہنے کے لئے بھی انسان کو چاہیئے کہ محفلیں برپا کرنے سے باز آجائے۔ اسی طرح عمدہ عمدہ قسم کی چیزیں کھانے اور کھلانے سے بھی انسان میں ایک خاص نوعیت کی وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ نے کبھی کسی چٹورے آدمی کو زیادہ دیر تک رال ٹپکائے بغیر باتیں کرتے نہ سُنا ہوگا۔ غرض مَیں جب بھی کوئی محفل برپا کرنے کا ارادہ کرتا ہوں یا دوستوں کی ضیافت کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نکالتا ہوں، میرے اہلِ خانہ اِس قسم کے دلائل پیش کر کے میرے ان ہر دو شوق کو جُوں کا تُوں معلّق چھوڑ دیتے ہیں۔ اِدھر مَیں کبھی کبھی اپنی عزّت بچانے کی خاطر دوستوں سے زوردار قسم کی ضیافت کِھلانے کا وعدہ کر لیتا ہوں، بلکہ مجھ سے بے اختیاری میں دن، تاریخ اور وقت کا تعین تک ہو جاتا ہے اور پھر احباب سے بار بار یہ بھی کہتا رہتا ہوں کہ دیکھنا دن، تاریخ اور وقت کی پابندی کا خیال رکھنا، بُھول مت جانا —— اور جب وہ دن، تاریخ اور وقت آتا ہے، تو مَیں گھر سے مع اہل و عیال غائب ہو جاتا ہوں، لیکن آپ میری بات کو یہیں ختم نہ سمجھیں۔ کبھی کبھی یار لوگ مجھے گھر پر آ کر پکڑ بھی لیتے ہیں اور مَیں اپنے گھر والوں سمیت پھنس بھی جاتا ہوں۔

ایک دفعہ مجھے اسی طرح جذبۂ محفل آرائی اور شوقِ ضیافت سامانی بُری طرح پریشان کر رہا

تھا کہ میرے ذہن کو ایک تدبیر سُوجھی — مَیں نے سب گھر والوں کو سامنے بٹھا کر اعلان کر دیا کہ ایک ہفتہ بعد اپنے گھر میں ایک زوردار قِسم کی محفلِ شعروسخن منعقد کر رہا ہوں اور اُس کے ساتھ ہی حاضرینِ محفل کو کھانا بھی کھلاؤں گا۔ جس فردِ بشر کو اس پر کوئی اعتراض ہو وہ ابھی بتا دے، ورنہ اِس کے بعد پھر کوئی عذر قابلِ پذیرائی نہ ہوگا — ویسے یہ بھی کان کھول کر سُن لیا جائے کہ اِس دفعہ مابدولت کا ارادہ بڑا پختہ ہے اور یہ کسی صورت میں بدلنے والا نہیں۔

سب سے پہلے بیگم بولیں "اگر گھر کا دیوالہ نکالنے کا پہلے ہی سے اس قدر پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو ہم سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

مَیں نے بھی سینہ تان کر جواب دیا "مَیں اس وقت صرف اعتراض سُننے کے مُوڈ میں ہوں۔ اعتراض کا دیباچہ ہرگز نہیں سُننا چاہتا۔"

بیگم نے جب دیکھا کہ مَیں اپنے شوہر ہونے کا ثبوت کچھ زیادہ ہی شدّومد سے دے رہا ہوں، تو وہ موقع کی نزاکت کو بھانپ کر خاموش ہوگئیں، لیکن بچّوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

"کون کون شاعر آرہے ہیں؟ پھٹیچر قسم کے شاعروں کو سُننے سے بہتر ہے کہ آدمی کوّے کی کائیں کائیں پر سردھننا شروع کر دے۔ کوئی شاعر اپنی غزل ترنّم سے تو نہیں پڑھے گا؟ — مشاعرہ کِس جگہ ہوگا؟ — داد دینے والے کہاں کہاں بیٹھیں گے؟ بوڑھے شاعر کتنے ہوں گے، جوان کتنے؟ کیا کوئی شاعرہ بھی تشریف لارہی ہیں؟ — اگر ایسا ہے، تو کیا بتایا جا سکتا ہے کہ موصوفہ کو کون شاعر لکھ کر دیتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ — ہم نے اگرچہ ان جُملہ سوالوں کے جواب ایک ایک کر کے دیئے، لیکن بعض سوالات سے تو گھر کی فضا خاصی درہم برہم ہوگئی۔ مثال کے طور پر جب ہم نے پہلے ہی سوال کا جواب دیا "عزیزو! ہم تمہیں کیا بتائیں کہ کون کون شاعر آرہا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ﴿ سے لے کر ے تک تمام شاعر آرہے ہیں!"

منجھلے بیٹے نے چونک کر کہا "ابا جان، کیا فرمایا آپ نے؟"

ہم نے جواباً عرض کیا "بھئی مَیں نے کہا ہے ا سے لے کر ے تک تمام شاعر آرہے ہیں۔"

بس ہمارا یہ جواب سُننا تھا کہ وہ عزیز ایک دَم بے ہوش ہو گیا۔ ہم کچھ نہ سمجھ سکے کہ کیا معاملہ ہے۔ کچھ دیر بعد برخوردار کو ہوش آیا، تو اس نے ہم سے دوبارہ وہی سوال کیا: "پیارے ابّا جان! کون کون شاعر ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں؟"

ہم نے پھر فخریہ انداز میں جواب دیا: "برخوردار! تمام شاعر آ رہے ہیں۔"

یہ سُن کر وہ عزیز دوبارہ بے ہوش ہو کر گرنے ہی والا تھا کہ ہم نے ڈانٹ پلائی: "بیہوش ہونے کے بجائے ہوش میں آ کر بات کرو۔"

وہ بولا: "اگر اتنے سارے شاعر پڑھیں گے، تو مشاعرہ قیامت سے پہلے ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔"

خیال تھا کہ مشاعرے سے پہلے شعرائے کرام کو مع سامعین ایک عُمدہ قسم کا ڈنر دیا جائے گا، لیکن ہمارا یہ خیال ابھی ہمارے دماغ سے چل کر لبوں تک ہی آیا تھا کہ تمام گھر والوں نے یک لخت شور مچانا شروع کر دیا: "ایسا کبھی نہیں ہوگا.... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

ہم نے پُوچھا: "کیوں نہیں ہوگا؟"

ہمارے سوال کا جواب دینے کے بجائے سب نے یک زبان ہو کر کہا: "ایسا کیوں ہوگا؟"

"اس لئے کہ مشاعرے کا صحیح وقت رات کا ہوتا ہے۔"

"کیا مشاعرہ بھی کوئی راگ ہے جس کے لئے وقت مخصوص ہے؟"

ہم نے جل کر پوچھا: "تو کیا تمہارا خیال ہے مشاعرہ صبح سات بجے سے شروع کر دیا جائے؟"

"میں کہتی ہوں خواہ مخواہ کج بحثی نہ کرو۔ ڈنر کھلانے کی ہم میں ہمت نہیں۔"

اگرچہ بیوی کی بات کوئی اتنی زیادہ معقول نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود ہماری سمجھ میں آگئی اور ہم اِس بات پر رضامند ہو گئے کہ تین بجے مشاعرے کا آغاز ہو اور بعد میں شاعر حضرات کو حاضرین سمیت ایک عصرانہ دیا جائے۔

اب سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ عصرانہ میں چائے کے ساتھ کھانے کے لئے کیا کچھ ہونا چاہیئے۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ چائے کے ساتھ ایک ایک بسکٹ کافی

رہے گا۔ یہ مشورہ سُن کر ہمیں یوں لگا جیسے کسی نے ہماری ناک پکڑ کر ہمارے دونوں گالوں پر زور کے تھپڑ رسید کر دیے ہیں۔ ہم نے بیوی سے صاف صاف کہہ دیا کہ بہتر یہی ہے آپ خاموش رہیں۔ اس پر وہ ناراض ہوگئیں اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں "میں پاگل ہوں جو آپ کے اس طرح کے بے تُکے پروگراموں میں بلاوجہ مشورہ دے کر اپنا وقت ضائع کرتی ہوں۔ آپ جانیں اور آپ کا یہ عصرانہ"۔

ہم نے سوچا ایسے موقعوں پر اگر ہمیں کوئی صحیح رائے دے سکتا ہے، تو وہ ہمارا یارِ غار شیخ مظہر اقبال ہے ۔ یہ حضرت آئے دن اپنے یا اپنے عزیزوں کے ہاں اس قسم کی تقاریب برپا کرتے رہتے ہیں، للہذا کیوں نہ انہیں فوراً بلا کر مشورہ طلب کیا جائے۔ اُسی وقت شیخ صاحب کو فون کیا اور کچھ دیر بعد یہ حضرت اپنی ایک عدد توند اور خشخشی ڈاڑھی سمیت ہمارے سامنے موجود تھے۔ آتے ہی اپنے خاص لاہوری لب و لہجے میں کہنے لگے "بادشاہو! یاراں نوُں کیویں یاد کیتا اے؟"

عرض کیا "گھر پر ایک عدد مشاعرہ برپا کرنے کے ساتھ ایک عدد عصرانہ بھی دے رہا ہوں"۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔ شاعروں کو بُلانے کی ذمہ داری میری ہے اور عصرانے کا انتظام آپ کا"۔

"جو آئٹم آپ ضروری سمجھتے ہیں وہ بتا دیجیے، باقی مَیں خود کر لوں گا"۔

"مجھ سے پُوچھنا ضروری ہے؟"

"بالکل"۔

"تو پھر سُن لیجیے کہ . . . ارے ہاں آپ نے مہمانوں کی تعداد پُوچھی ہی نہیں"۔

"بھُول چُوک کی معافی چاہتا ہوں ۔ مہمانوں کی تعداد بھی بتا دیجیے"۔

"شاعروں سمیت کم از کم سو مہمان تو ضرور ہوں گے"۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا، اس سے کم کیا ہوں گے ۔ اب جلدی سے اپنی ضروری چیزوں کا نام لیجیے"۔

"یوں چائے کے ساتھ آپ مہمانوں کو خواہ کچھ پیش کر دیجئے، لیکن ایک ایک مہمان کے لئے ایک عدد چرغہ ضرور ہوگا۔"

"جی کیا فرمایا؟" شیخ مظہر اقبال نے بڑی حیرانی سے پُوچھا۔

"شیخ صاحب! آپ تو اس طرح پُوچھ رہے ہیں جیسے آج تک آپ نے چرغہ، یعنی آگ پر بُھنا ہوا مُرغا ہی نہیں دیکھا ...."

"چرغہ مَیں نے دیکھا بھی ہے اور کھایا بھی، لیکن ...."

"لیکن کیا؟"

"آپ کو معلوم ہے ایک عدد چرغہ کی کم سے کم قیمت کیا ہوگی؟"

"کیا ہوگی؟"

"یہی کوئی بیس روپے۔"

"پھر کیا ہوا؟" ہم نے یہ تین الفاظ اِس زور دار لہجے میں ادا کیے کہ بے چارے مظہر اقبال ہمیں خوف اور حیرانی کے مِلے جُلے جذبات سے بُت بنے دیکھنے لگے — جب ہم نے دیکھا کہ مظہر اقبال کا خوف اور حیرانی دُور نہیں ہو رہے، تو غصّے میں آکر کہا: "یار، خاموش کیوں ہو گئے، کچھ منہ سے تو بولو۔"

"آپ ایک ایک مہمان کو چرغہ کھلائیں گے؟"

"جی ہاں بالکل کھلاؤں گا۔"

"اور آپ کے مہمان کم سے کم سو ہوں گے۔"

"یہ بھی درُست ہے۔"

"اور آپ نے یہ بھی سُن لیا ہے کہ فی چرغہ بیس روپے قیمت ہوگی۔"

"یہ بھی سُن لیا ہے۔"

"گویا آپ دو ہزار روپے کے چرغے کھلائیں گے؟"

"پھر کیا ہوا۔" ہم نے اس بار جو "پھر کیا ہوا" کے الفاظ دہرائے، تو مظہر اقبال نے ہماری طرف اس طرح دیکھا جیسے ہم، ہم نہیں ہیں اور وہ، وہ نہیں۔ سر کو جھٹک کر کہنے لگا: "آپ

چائے کے ساتھ چرغہ ۔ ۔ ۔ "

ہم نے لقمہ دیا: "چرغہ ہی نہیں کیک پیسٹری اور پھل کھلانے کا بھی ارادہ ہے۔ ان دونوں چیزوں کے لئے دس روپے فی کس اور رکھ لیجئے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ مزید کھلانا چاہیں وہ آپ کی مرضی۔"

"چرغہ، کیک پیسٹری اور پھل کے بعد بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے؟ میرا خیال ہے عصرانے کے بجائے آپ اپنے مہمانوں کو رات کا کھانا کیوں نہیں کھلاتے؟"

"گھر والے نہیں مانتے۔"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں رات کے کھانے سے دیوالہ نکل جائے گا۔"

"جتنا خرچ آپ عصرانے پر کر رہے ہیں اُتنے میں یعنی تین ہزار میں میں آپ کو کھانا کِھلا سکتا ہوں۔"

"کھانا پھر کبھی سہی، اس دفعہ آپ صرف عصرانے کا بندوبست کیجئے۔"

مظہر اقبال نے ہماری طرف اس بار پھر عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کچھ لمحے بعد ان نظروں میں یقین اور یگانگت کی چمک لاتے ہوئے یہ کہہ کر چلا گیا: "کسی قسم کا فکر نہ کریں، سب انتظام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔"

ہماری خوش قسمتی دیکھئے کہ اُن دنوں لاہور میں پاکستان کے ہر بڑے شہر سے شاعر آئے ہوئے تھے، لہٰذا ہم نے سب کو مدعو کر لیا اور سبھی نے ہماری دعوت کو شرفِ قبولیت بخش دیا۔ اس خیال سے کہ ملک کے قریب قریب تمام بڑے شاعر ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں، ہم خوش ہو کر بستر پر پڑے ہوئے کبھی گنگنا رہے تھے اور کبھی سیٹی بجا رہے تھے کہ بیگم نے پُوچھا: "آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں، حالانکہ سچ پُوچھئے تو فکر کی بات ہے۔"

"فکر کِس بات کی؟"

"آخر جب یہ لوگ آئیں گے، کم از کم اُنہیں ایک پیالی چائے تو ضرور پلانا ہوگی۔"

"غم نہ کرو، یہ انتظام مَیں نے مظہر اقبال کے سپُرد کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر جب میں نے مزید

تفصیل بتائی تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ابھی ہنگامہ جاری تھا کہ شیخ مظہر اقبال کا فون آیا:
"سیّد صاحب! دو دن باقی رہ گئے ہیں اور آپ نے مجھے ایک فون بھی نہ کیا، پھر بھی میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ چرغے والے کو بھی کہہ دیا ہے اور کیک پیسٹری والے کو بھی۔"

"مگر شیخ صاحب آپ کوئی فکر نہ کریں۔"

"کیا مطلب؟" مظہر اقبال نے اس طرح چونک کر پوچھا جیسے خدانخواستہ اس پر بجلی وغیرہ قسم کی کوئی چیز گر پڑی ہے۔

"مطلب یہ ہے کہ عصرانے کا انتظام میں خود کر رہا ہوں۔"

"مگر۔"

"مگر وگر کچھ نہیں، بس۔ آپ تشریف لے آئیں۔ آپ کا یہی کرم ہوگا۔"

"کیا بات ہے مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں، آپ وقت مقررہ پر آجائیں۔"

ابھی مظہر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہم نے فون بند کر دیا۔ بیوی سے کہا: "دیکھو اس میں عزت کا سوال ہے۔ بہتر یہی تھا کہ عصرانے کا انتظام مظہر اقبال کرتا۔"

"میں کہتی ہوں اوّل تو آپ کو مشاعرہ بازی قسم کی بلا اپنے سر مول ہی نہیں لینا چاہیئے تھی، بہرحال اب آپ اعلان کر چکے ہیں، تو چائے کا انتظام میں خود کروں گی ۔۔ اور دیکھ لیجئے گا آپ کے شیخ مظہر اقبال سے ہزار درجہ بہتر ہوگا۔"

"اگر یوں ہے، تو پھر میری ایک بات کان کھول کر سُن لو کہ مجھے اِس طرح کی دعوتیں کھلانے کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ آپ جانیں اور آپ کے نیچے۔"

"کہہ جو دیا یہ سب کام مجھ پر چھوڑیں۔" اگرچہ بیوی کی باتوں پر کسی شوہر کا مطمئن ہونا سراسر مردانگی کے خلاف ہے، لیکن ہم اُس وقت بیگم کے اس فقرہ سے نہ صرف مطمئن، بلکہ بالکل مطمئن ہوگئے۔ اس اطمینان کے بعد اب ہمارے سامنے شاعروں کو بُلانا اور اُن سے پڑھوانا تھا اور یہ ہمارے لئے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

ہم نے اپنے ہم عمر شعرا سے صاف صاف کہہ دیا: "بھائیو! تمہیں میرے گھر خود آنا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ لانے لے جانے کے لئے کوئی سواری کا انتظام نہیں۔ مَیں اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ یہ مدد کرسکتا ہوں کہ اپنے گھر کا پتہ صحیح اور واضح طور پر بتا دوں۔" چنانچہ ہم نے اپنے گھر کا پتہ کئی کئی بار کاغذ پر نقشہ بنا کر اپنے اِن شاعر دوستوں کو بتایا اور جب تک انہوں نے اچھی طرح تسلیم نہ کر لیا کہ وہ ہمارا بنایا ہوا نقشہ سمجھ گئے ہیں ہم نے کاغذ پر لکیریں بنانا نہیں چھوڑا — اب یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ ہماری اِس تمام وضاحت کے باوجود ہمارے کئی شاعر دوست جائے مشاعرہ یعنی ہمارے گھر نہ پہنچ سکے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے اور اگر اُن میں سے کچھ پہنچے بھی تو اس وقت جب نہ صرف مشاعرہ ختم ہو چکا تھا، بلکہ ہم مع اہل و عیال سو چکے تھے — بہرحال پھر بھی بہت سے شاعر وقت پر پہنچ گئے اور اُن میں سے دو ایک تو بالکل صحیح سلامت پہنچے۔ باقی ہم اپنے اُن شاعر دوستوں کے بے حد شکر گزار بھی ہیں اور شرمندہ بھی جو ہمارے مشاعرہ میں شریک ہوئے، لیکن کسی کی پتلون پھٹی ہوئی تھی، تو کسی کا پاجامہ، کوئی کیچڑ میں لت پت ہوا آرہا تھا، تو کوئی گندے پانی میں سر ڈوب — قصہ دراصل ایسے ہے کہ ہمارے محلے میں ایک ڈپٹی صاحب رہتے ہیں، اُن کا کتا، مشاعرہ شروع ہونے سے ذرا پہلے کھُل گیا۔ ویسے تو یہ کتا بے حد شریف واقع ہوا ہے، لیکن بقول ڈپٹی صاحب، اس کی طبیعت میں معمولی سی شوخی ہے جس کی وجہ سے وہ اجنبی کو دیکھ کر بھونکنے لگتا ہے۔ اگر اجنبی اس کے بھونکنے کا کوئی نوٹس نہ لے، تو یہ کتا کچھ نہیں کہتا، لیکن اگر اُس کے بھونکنے کے جواب میں یہ بھی ہاں ہوں کردے یا ڈر جائے، تو پھر ازراہِ مذاق یہ اُس کے کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کا کہنا ہے اور ہمارا تجربہ بھی ہے کہ آج تک اِس کُتّے نے کسی کو نہیں کاٹا گھر والوں سمیت اس بے زبان نے ہمارے بھی صرف کپڑے ہی پھاڑے ہیں؛ چنانچہ اس سے بچنے کے لئے ہم نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ گھر میں کچھا پہنتے ہیں اور کچھے کے اُوپر دھوتی باندھتے ہیں۔ جیسے ہی ڈپٹی صاحب کے کُتّے کی طبیعت موج میں آتی ہے اور یہ ہماری طرف لپکتا ہے ہم فوراً دھوتی اُس کے منہ پر پھینک کر گھر آجاتے ہیں۔ اب یہ ڈپٹی صاحب اور اُن کے گھر والوں کی شرافت ہے کہ اُن کے گھر سے ہماری دھوتی کبھی پھٹی ہوئی نہیں آئی۔ یا تو اُسے رفو کرا دیا جاتا ہے اور اگر کُتّے نے زیادہ ہی شوخی سے کام لیا ہے تو اُسے یعنی ہماری دھوتی کو

پیوند لگا دیا جاتا ہے۔ ہاں تو ہم اپنے اُن شاعر دوستوں کا ذِکر کر رہے تھے جو ہمارے مشاعرہ میں پیدل شریک ہوئے اور جن کے ساتھ ڈپٹی صاحب کے کُتّے نے ذرا چھیڑ چھاڑ سے کام لیا، لیکن جو شاعر، کُتّے سے بچ گئے وہ ہمارے گھر کے سامنے والے چوبچے میں گرتے رہے۔ اس میں بھی ہماری کوئی غلطی نہ تھی۔ ہم نے تو احتیاط کے طور پر اُس چوبچے کو لکڑی کے تختے سے ڈھک دیا تھا، لیکن یہ شعراء حضرات معلوم نہیں کس زاویے سے پاؤں رکھتے تھے کہ وہ ایک دم اُٹھ جاتا تھا اور اُن کا پاؤں سیدھا چوبچے میں چلا جاتا — پھر مزید ستم ظریفی یہ ہوتی رہی کہ جو شعرا چوبچے میں گرے اُن میں سے کسی نے بھی اتنی زحمت نہیں فرمائی یا کسی نے غصّے میں آکر ہی اتنا نہیں کیا کہ اُس تختے کو اُٹھا کر الگ پھینک دیتا، بلکہ ہوتا یہ رہا کہ جو شاعر چوبچے میں گرتا اُس کی زبان سے پہلے ذرا "ارے"، نکلتا اور پھر چوبچے سے گنگناتا ہوا باہر آتا تو اُس تختے کو اصل پوزیشن میں رکھتے ہوئے کہتا: "لے پیارے تو نے ہمیں پریشان کر دیا، تو کیا ہوا ہم تجھے پریشان نہیں کریں گے۔"

غرض یہ تو ہمارے ہم عمر شعرائے کے ساتھ ہوا، اب ذرا بزرگ شعرا کا حال سُنیئے — انہیں بلانے کے لئے ہم نے اپنے مختلف دوستوں کو مامور کر دیا تھا کہ وہ ان بزرگ شعرا کو اپنی اپنی موٹر کاروں میں لے کر آئیں گے۔ جوان اور ادھیڑ عمر کے شعرا تشریف لا چکے تھے، لیکن ابھی تک بزرگ شاعروں میں سے ایک بھی نہیں آیا تھا — پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ بزرگ شاعر ہیں، تو اُن کی بزرگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ذرا تاخیر سے آئیں، لیکن جب تاخیر طویل ہونے لگی، تو ہمیں فکر لاحق ہوئی اور ندامت بھی کہ سامعین کہہ رہے تھے: "جی ایسے معمولی معمولی مشاعروں میں بڑے شاعر کب آتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمارے چھوٹے برخوردار نے قریب آکر کان میں کہا: "کراچی والے بزرگ شاعر تشریف لا رہے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"باہر دُور سڑک پر۔"

"کیا وہ پیدل چلے آ رہے ہیں؟"

"جی ہاں"۔

"انہیں تو خواجہ اظہر صاحب کی کار لینے گئی تھی"۔

"جی ہاں"۔

"کار کہاں ہے؟"

"وہ شاعر صاحب کے پیچھے چلی آ رہی ہے"۔

ہم یہ سُن کر باہر نکلے اور بھاگتے ہوئے ان شاعر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پتہ چلا کہ وہ بزرگوار ناراض ہیں ــ عرض کیا "قبلہ آپ پاپیادہ تشریف لا رہے ہیں"۔

"تو کیا... تو کیا... بس مجھ سے غصے میں کچھ اور نہ کہلواؤ"۔

"آخر آپ موٹر میں کیوں نہیں بیٹھے۔

"کون سی موٹر میں؟"

"جو آپ کے پیچھے چلی آ رہی ہے"۔

"یہ آپ نے میرے لئے بھیجی تھی؟"

"جی ہاں"۔

"ڈرائیور سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شاعر صاحب کے گھر موٹر پہنچنے سے پہلے شاعر صاحب گھر سے پیدل روانہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ڈرائیور نے سوچا کہ اگر میں، شاعر صاحب سے یہ کہوں گا کہ موٹر میں بیٹھ جائیے، تو اس طرح خطرہ ہے کہ جو شعر وہ سوچتے آ رہے ہیں اُس میں خلل واقع ہو جائے گا، اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہوں۔ جب شعر مکمل ہو جائیں گے، یہ خود بخود گاڑی میں تشریف لے آئیں گے، لیکن حادثہ یہ ہوا کہ منزل قریب آگئی، شاعر موٹر میں نہیں آئے۔ ظاہر ہے کہ اِس تاویل کے بعد ہم ڈرائیور کو کیا کہہ سکتے تھے، سوائے اس کے کہ اُسے داد دیتے اور دل ہی دل میں خوش ہو لیتے کہ ماشاءاللہ، خواجہ اظہر صاحب نے بھی کیا نستعلیق قسم کا ڈرائیور ملازم رکھا ہے ـــ بخاری کو ہم نے ایک بہت بڑے بزرگ شاعر کے لئے منتخب کیا کہ وہ اُنہیں اپنی گاڑی میں لے کر آئیں، لیکن سب شاعر آ گئے، وہ بزرگ شاعر اور اُن کے ساتھ بخاری غائب تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان صاحبان کے ساتھ کیا حادثہ

پیش آیا۔ کسی نے کہا، بخاری ابھی گھر سے ہی نہیں نکلے ہوں گے، کوئی بولا گھر سے نکلنا، تو بڑی بات ہے وہ حضرت ابھی بستر پر پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ کسی کا خیال تھا بخاری ایسا غیر ذمّے دار آدمی نہیں۔ گھر سے یقیناً نکل پڑا ہے۔ بس راستے میں کوئی خوبصورت چیز نظر آگئی ہوگی اُسے کھڑا دیکھ یا جھانک رہا ہوگا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بُخاری مع اُن بزرگ شاعر کے نمودار ہوئے۔ تاخیر کا سبب پُوچھا تو چُپکے سے کہنے لگے "یار ان بزرگ شاعر کی جوان بیوی نے مجھے اپنی باتوں میں لگالیا اور یہ خیال ہی نہ رہا کہ یہاں مشاعرہ کرنا ہے۔ اچانک گھڑی پر نظر پڑی تو تمہارا مشاعرہ یاد آیا، تب کہیں جاکر ان بزرگوار کو موٹر میں ڈالا اور تمہاری خدمت میں حاضر کر دیا۔ آئندہ کبھی مجھے کسی بُوڑھے شاعر کے گھر نہ بھیجنا، اِن کی جوان بیویوں سے میری جان نکلتی ہے ــ یہ بڑی خونخوار قسم کی ہوتی ہیں۔"

مشاعرہ شروع ہونے لگا، تو مولوی افسر عباس میرے پاس آئے، کہنے لگے "بھائی مشکور! صدارت کون کرے گا؟"

"کیوں اس میں کون سی مشکل آن پڑی ہے؟"

"ارے بھائی ہر شاعر اپنے طور پر یہ سمجھے ہوئے ہے کہ اُسے صدارت کی کُرسی پر بیٹھنا ہے۔"

"آپ نے کیسے اندازہ لگالیا؟"

"جیسے ہی کوئی شاعر محفل میں آتا ہے، تو بیٹھتے ہی یہ کہتا ہے "صاحبان! کچھ دیر کے لئے مجھے بھی یہاں تھوڑی سی جگہ دے دیجئے۔ پھر تو نہ جانے کتنے وقت کے لئے بندھ کر بیٹھنا ہوگا۔"

"قصّہ دراصل ... یہ ہے ..."

"ہاں ... ہاں ... صاف صاف بتاؤ پیارے تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہے۔"

"کوئی شرارت نہیں کی صرف جُملہ شعرا کو اپنے گھر بُلانے کے لئے میں نے ہر شاعر کو مدعو کرتے وقت یہ کہا تھا کہ حضرت آپ اس مشاعرہ کے صدر ہوں گے اس لئے آپ کا آنا نہایت ضروری ہے؛ چنانچہ دیکھ لیجئے اس وقت میرے غریب خانہ پر ہر شاعر موجود ہے۔"

مولوی افسر عباس بولے "مگر بھائی! اسٹیج سیکرٹری بنا کر مجھے تو اچھی خاصی مصیبت میں ڈال دیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس کو صدر بناؤں، کسے نہ بناؤں . . . ہُنہ"

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، اس مسئلے کا حل بہت ہی سیدھا سا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ا کی صدارت میں ب کو پڑھوائیے اور ب کی صدارت میں ت کو اور اسی طرح ی تک پہنچ جائیے۔" ہم نے مولانا افسر عباس کی ایک فٹ لمبی ڈاڑھی کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا ـــ اس پر مولانا نے جھنجلا کر کہا: "لاحول ولاقوۃ . . . تمہارا مطلب ہے میں ہر بار مشاعرے کا صدر تبدیل کرتا رہوں۔"

"اس میں کیا حرج ہے؟"

"واللہ کس خوبی سے جناب نے مسئلے کا حل پیش فرمایا ہے۔ اگر یہ بات ہے، تو میں اسٹیج سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہوتا ہوں ـــ" اب ہم ہیں کہ بھرے مشاعرے میں مولوی صاحب کی منت سماجت کر رہے ہیں، اُن کی ڈاڑھی چھو رہے ہیں اور وہ ہیں کہ سیکرٹری بننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں۔ انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ کسی ناراضی کی بنا پر نہیں، بلکہ اس واضح حقیقت کے پیشِ نظر اسٹیج سیکرٹری نہیں بن رہے ہیں کہ اُن کی ڈاڑھی دیکھ کر بہت سے شاعر بھاگ جائیں گے اور جو نہیں بھاگ سکیں گے اُن کی خوف کے مارے گھگھی بندھ جائیگی۔

اب ہمیں اسٹیج سیکرٹری کی فکر ہوئی، لیکن قادری صاحب نے اس خدمت کے لئے خود کو پیش کر کے ہماری مشکل آسان کر دی ـــ خدا خدا کر کے مشاعرہ شروع ہوا۔ ابھی دوسرے شاعر ہی نے اپنی غزل کا آغاز کیا تھا کہ صاحبِ صدر نے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بُلایا۔ ہم قریب گئے، تو موصوف نے ہمارے کان میں کہا: "عزیزم آپ نے مجھے اس محفل کا صدر بنا کر سخت آفت میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟"

"کیا بتاؤں، یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کُرسیٔ صدارت پر نہیں بیٹھا، بلکہ سُولی پر لٹکا دیا گیا ہوں۔"

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"برخور دار! قصّہ دراصل یہ ہے کہ مَیں بواسیر کا مریض ہوں"۔

"تو کیا جناب کو گلے میں بواسیر ہو گئی ہے؟"

"یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟"

"آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ کُرسیٔ صدارت پر بیٹھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سُولی پر چڑھا دیا گیا ہوں"۔

تمہارا مطلب ہے سُولی کی تکلیف صرف گلے میں ہوتی ہے ٹانگوں کے درمیان نہیں ہو سکتی؟" جی میں آیا کہ صاحبِ صدر کو جواب دوں کہ قبلہ مجھے سُولی پر لٹکنے کا تجربہ نہیں، مگر خاموش ہو گیا اور صرف اتنا کہا: "آپ ہی فرمایئے مَیں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں"۔ اگرچہ اس کے بعد صاحبِ صدر نے براہِ راست ہم سے کوئی شکایت نہیں کی، لیکن حقیقت ہے کہ پھر وہ کرسیٔ صدارت پر ٹِک کر نہیں بیٹھے۔ ہر شاعر کو کھڑے ہو ہو کر داد دیتے رہے یا اکڑوں بیٹھ کر۔ صاحبِ صدر کا کسی کسی شعر پر داد دینا تو بھلا معلوم ہوتا ہے، لیکن ہر شعر پر داد دینا اور وہ بھی کھڑے ہو کر یا اکڑوں بیٹھ کر، بس یوں لگتا تھا جیسے محفل بغیر صدر کے جاری ہے اور کوئی سامعین میں سے دادِ سُخن دیتا ہوا اُچھل کر صدارت کی کُرسی پر آ بیٹھا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ محفل میں سب خاموش ہیں اور تنہا صاحبِ صدر کھڑے ہو ہو کر یا اُکڑوں ہو کر داد دے رہے ہیں۔ ہم نے صاحبِ صدر کو احساس دلایا کہ ہر شعر پر داد دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس پر موصوف نے فرمایا: "اگر ہر شعر پر داد دینا کوئی اچھی بات نہیں، تو شعرا سے کہیے کہ وہ اپنے عُمدہ شعر سنائیں، تاکہ ہماری داد اکارت نہ جائے"۔

"آخر آپ داد کیوں دیتے ہیں؟"

"وہ تو مجھے مجبوراً دینا پڑ رہی ہے اور اُٹھ اُٹھ کر دینا پڑ رہی ہے"۔

"چلیئے کم از کم بیٹھ کر ہی داد دیجئے"۔

"بیٹھتا ہوں، تو تمہاری کُرسی درمیان سے اُبھری ہوئی ہے، وہ نوکِ خنجر کی طرح مجھے زخمی کر رہی ہے۔ جیسا کہ تمہیں ابھی بتایا تھا مَیں بواسیر کا مریض ہوں۔ اگر تمہارا مشاعرہ جلدی

ختم نہ ہوا اور یُونہی جاری رہا تو کُرسی سے خُون جاری ہو جائے گا۔"

"میرے خیال میں اگر آپ ایک دفعہ ضبط کر کے بیٹھ جائیں اور اپنی جگہ پر ڈٹے رہیں تو ایسا بُرا حال نہ ہو۔"

"مشورے کا شکریہ۔ کاش! اس وقت تم میری جگہ ہوتے تو پتہ چلتا کہ تجربہ کیا چیز ہوتا ہے اور مشورہ کیا۔"

ابھی ہم صاحبِ صدر کے اندازِ تحسین سے لُطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے برابر سے کسی نے شاعر کے شعر کی داد دیتے ہوئے فرمایا: "اے واللہ کیا ٹماٹر سے زیادہ سُرخ اور چمک دار شعر کہا ہے۔" پتہ چلا کہ کوئی سبزی فروش، مشاعرہ میں تشریف لے آئے ہیں — ٹماٹر والی داد ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی: "شعر کیا ہے لوہے کا سُرخ جلتا ہوا ٹکڑا ہے اور اس پر شاعر کی رُعب دار آواز یوں معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی مضبوط ہاتھ پُوری قوت سے ہتھوڑے چلا رہا ہے۔" ہم نے سوچا کوئی لوہار صاحب بھی ہمارے مشاعرے میں بہ نفسِ نفیس موجود ہیں۔ ہتھوڑے اور لوہے کے ب[illegible] ہوئے ٹکڑے کا تصوّر ذہن سے دُور نہ ہوا تھا کہ ایک کونے سے آواز اُٹھی: "پُوری غزل قینچی کی طرح چلتی رہی ہے اور شعر نے اُسترے کا کام کیا ہے۔" ماشاءاللہ سبزی فروش اور لوہار ہی نہیں کوئی خلیفہ جی بھی ہماری اِس محفلِ شعر و سُخن کو رونق بخشنے کے لئے جلوہ افروز ہیں۔ ہم اپنی محفل کے عوامی ہونے پر ناز کرنے ہی والے تھے کہ اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا: "میں سامعینِ کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ داد دیتے وقت اپنے پیشے کو دل سے فراموش کر کے داد دیں۔ ابھی ہم لوگ اتنے عوامی نہیں ہوئے ہیں کہ شعر کی داد بھی اُسی انداز میں دیں۔" سیکرٹری کے اس اعلان پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سبزی فروش، لوہار اور حجام اپنے حامی و مددگار بھی لے کر آئے تھے۔

ہر ایک نے شور مچا ڈالا:

"کیا آپ نے ٹماٹر نہیں دیکھا؟"

"کیا ہتھوڑے سے آپ ڈرتے ہیں؟"

"کیا قینچی اور اُسترے سے آپ کا کبھی واسطہ نہیں پڑا؟"

"ٹماٹر، ہتھوڑا، قینچی اور اُسترا ہماری زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ ہم ان کے ذکر سے کبھی باز نہ آئیں گے — ٹماٹر زندہ باد — ہتھوڑا زندہ باد، قینچی اور اُسترا دونوں زندہ باد —"

جب ہم نے دیکھا کہ محفل درہم برہم ہوا چاہتی ہے اور کوئی اس کو سنبھالنے کے لئے آگے نہیں بڑھتا، تو ہم خود حاضرین سے مخاطب ہونے کے لئے کھڑے ہو گئے: "معزز سامعین! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ مجھے ٹماٹر بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں قریب قریب ہر روز ٹماٹر کھاتا ہوں۔ اسی طرح مجھے ہتھوڑے سے بھی ایک طرح کا عشق ہے۔ قینچی اور اُسترا تو میری جان ہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں میں ہر روز حجامت کرانے کا قائل ہوں۔"

ہماری اس مختصر سی تقریر کا سامعین پر نہایت اچھا اثر پڑا اور محفل دوبارہ جم گئی، لیکن ہم اپنے آپ کو لعن طعن کرتے رہے کہ ہم نے اِس محفلِ مشاعرہ کا اعلان اخبارات میں کس لئے کیا، کیونکہ جب ہم یہ اعلان اخبار والوں کو لکھوا رہے تھے، تو انہوں نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ آپ گھر پر یہ محفلِ مشاعرہ منعقد کرا رہے ہیں کیا آپ کے ہاں اتنی جگہ ہے کہ آنے والوں کو اچھی طرح بٹھا سکیں۔ جگہ کی بات چھوڑیئے یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ ہر طرح کا آدمی آپ کے مشاعرہ میں آجائے اور آپ کو لینے کے دینے پڑ جائیں — مگر اُس وقت ہم اخبار والوں کی تنبیہہ پر کیسے کان دھرتے، ہمیں تو اخبار میں اپنا نام دیکھنے کی ہوس نے بے چین کر رکھا تھا، بہر حال جوں توں کر کے مشاعرہ دوبارہ شروع ہُوا۔

شاعر نہایت اطمینان سے شعر پڑھ رہے تھے۔ سامعین نہایت اطمینان سے شعر سُن رہے تھے۔ صاحبِ صدر بھی اپنی جگہ ٹکے بیٹھے تھے۔ مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ اسلام آباد سے ہمارے ایک بھائی تشریف لائے۔ یہ صاحب بے حد دلچسپ آدمی ہیں۔ اپنے دل کی بات کہہ دینے میں نہایت بے باک۔ اسی طرح کسی کی تعریف یا تنقید کرتے وقت بھی کوئی لحاظ نہیں رکھتے، بس جو کچھ محسوس کرتے ہیں بیان فرما دیتے ہیں۔ ہم نے دل میں خیال کیا خدا خیر کرے اب یہ حضرت آئے ہیں، کوئی نیا گُل نہ کھلائیں۔ پہلے تو تمام حاضرین کے سروں پر سے گزرتے ہوئے گویا پوری محفل کو درہم برہم کرتے ہوئے موصوف عین صاحبِ صدر کی

کرُسی کے قریب آکر بیٹھ گئے اور پھر بیٹھتے ہی جو شاعر اپنا کلام پڑھ رہا تھا اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: "واللہ، حضرت یہ شعر آپ کے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں"۔ یہ سُنتے ہی شاعر نے انہیں عینک کے اُوپر سے گھُورتے ہوئے ڈانٹ پلائی: "اگر یہ میرے اپنے ہیں تو کیا باقی آپ لکھ کر دیتے ہیں"۔

"شاعر صاحب ناراض نہ ہوں، میرا مطلب تھا کہ ان اشعار کا معیار آپ سے ملتا جُلتا ہے"۔

اُن شاعر صاحب کے بعد ایک دوسرے بزرگ شاعر آئے تو اشعار سُن کر فرمانے لگے: "کوشش جاری رکھیے انشاء اللہ کسی روز اچھے شعر بھی کہنے لگیں گے"۔

ایک اور مشہور شاعر سے ہمارے یہ بھائی صاحب یوں مخاطب ہوئے: "برادرم! کیا آپ نے آج پہلی بار شعر کہنے کی زحمت فرمائی ہے؟"

وہ شاعر صاحب ناراض ہو کر بولے: "کیا مطلب؟"

"مَیں عرض کر رہا تھا کہ ایک شاعر کو اُس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آنا چاہیے جب تک وہ پختہ کلام نہ ہو جائے"۔

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

"آپ میرا مطلب کیوں سمجھنے لگے، آپ کو شہرت کی ہوس خراب کر رہی ہے"۔

"حضرت آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔ مَیں ایک مشہور شاعر ہوں"۔

"معلوم نہیں کن ناسمجھ لوگوں نے آپ کو مشہور کر دیا"۔

بڑی مشکل سے ہم نے شاعر صاحب کو اُن حضرت سے رہائی دلائی۔ اِس پر بھی وہ شاعر صاحب آج تک ہم سے ناراض ہیں۔ اس کے بعد ایک اور شاعر اپنا کلام پڑھنے کھڑے ہوئے۔ ابھی انہوں نے مطلع ہی عرض کیا تھا کہ ہمارے یہ بھائی صاحب چیخ اُٹھے: "جنابِ شاعر صاحب آپ کی یہ غزل سُنتے سُنتے میرے کان پک چکے ہیں — ہر مشاعرے میں آپ یہی غزل پڑھتے ہیں۔ خدا کے لئے اتنا بتا دیجئے کہ دوسری غزل کب تصنیف فرما رہے ہیں، تاکہ اتنے عرصے میں یہ خاکسار اپنے کانوں کا علاج کرا لے"۔

ہمارا مشاعرہ یقیناً نہایت خیروعافیت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا، لیکن ہمارے یہ بھائی صاحب خاصی بدمزگی پیدا کرتے رہے ۔ آخری شاعر اپنا کلام سُنا رہے تھے کہ ہمارے ایک فرزند نے ہمارے کان میں ارشاد فرمایا "ابا جان! ہم نے لان میں چائے کا انتظام کیا تھا، لیکن ہماری تمام میز کُرسیاں ڈپٹی صاحب اپنے گھر اٹھوا کر لے گئے۔"

"تم نے اُنہیں منع نہیں کیا؟"

منع کیا، تو کہنے لگے: "بیٹا، میرے گھر زیادہ اہم تقریب ہے، زیادہ بڑے آدمی آ رہے ہیں اور تمہارے ہاں صرف شاعر لوگ ہیں یا انہیں سُننے والے، اس لئے اِن میز کُرسیوں کی ضرورت میرے گھر زیادہ ہے۔ مَیں نے بھی میز کرُسیاں منگائی تھیں، لیکن وہ ابھی تک نہیں آئیں۔" برخوردار کا یہ بیان سُن کر ہم نے گھبرا کر پُوچھا: "اب کیا ہوگا؟"

"یہی تو مَیں آپ سے پُوچھنے آیا ہوں۔"

ہم فوراً مشاعرے میں سے لرزتے کانپتے اُٹھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا جس کے نتیجے میں ہم نے اپنا پاؤں ایک بزرگ شاعر کی ران پر رکھ دیا۔ وہ بے چارے تڑپ اُٹھے: "ہائے مار ڈالا ظالم۔"

ہم نے اُن سے معافی مانگی اور باہر نکل گئے۔ ایک دَم خیال آیا اس وقت اگر کوئی ہماری مدد کر سکتا ہے، تو وہ ہمارا یارِ غار مظہر اقبال ہے؛ چنانچہ اُسے آواز دی: "یا مظہر العجائب ہماری مدد فرمایئے۔" مظہر صاحب نے ایک لمحہ کو اپنی توند پر ہاتھ پھیرا۔ ذرا ڈاڑھی کھُجلائی اور چہک کر بولے: "کوئی فکر کی بات نہیں، جیسے ہی مشاعرہ ختم ہو تمام حاضرین سے کہہ دیجئے کہ جہاں بیٹھے ہیں وہیں بیٹھے رہیں، بلکہ قطار بنا کر بیٹھیں اور جب حاضرین ٹھیک ہو کر بیٹھ جائیں، تو اُن کے سامنے چائے رکھ دیجئے۔"

ہم نے مظہر اقبال کا شکریہ ادا کیا اور بیٹے کو ہدایت کر دی کہ "جیسے ہی مشاعرہ ختم ہو اور ہم تالی بجا کر یہ اعلان کریں کہ چائے لے آؤ" تم فوراً چائے اندر لے آنا۔" اس پر ہمارے فرزندِ ارجمند بولے: "مگر ابا جان!"

"مگر کیا؟"

"جی کچھ نہیں۔" بیٹا یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

جیسے ہی اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا: "اب مشاعرے کے آخر میں میں صاحبِ صدر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے کلامِ بلاغت نظام سے حاضرین محفل کو محظوظ فرمائیں۔" تو ہمارے اسلام آباد سے آنے والے بھائی نے جلدی سے میرے قریب ہو کر پوچھا: "بھائی مشکور صاحب، کیا صاحبِ صدر بھی شاعر ہیں؟"

"آپ کو، اُن کے شاعر ہونے میں کس وجہ سے شک ہوا؟"

"چہرے سے تو یہ کوئی اسمگلر معلوم ہو رہے ہیں۔"

"بندہ خدا، یہ تو ہمارے شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔"

"اسی لئے تو میرا خیال اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔"

"آپ خاموش رہیں۔" ہم نے ذرا آنکھیں نکال کر کہا، مگر جونہی صاحبِ صدر نے شعر پڑھا، تو ہمارے یہ بھائی صاحب کچھ کہنے لگے تھے کہ ہم نے اُن کے مُنہ پر زور سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور جب تک صاحبِ صدر نے اپنی مانگی ہوئی غزل غلط سلط انداز میں ختم نہ کرلی اسی طرح اُن کے مُنہ پر ہاتھ رکھّے رکھّا۔ ہمارے اس فعل کی برکت سے صاحبِ صدر نے غزل تو ضرور پڑھ لی، لیکن ہم یہ بات بھُول گئے کہ حاضرین کو اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کی درخواست ہمیں ہی کرنا ہے، کیونکہ ہم نے ابھی تک اسٹیج سیکرٹری کو یہ نہیں بتایا تھا کہ چائے باہر کے بجائے اندر بلائی جائے گی؛ چنانچہ صاحبِ صدر کی غزل کے فوراً بعد اسٹیج سیکرٹری کھڑے ہوئے۔ وہ اعلان کرنے ہی والے تھے کہ ہم جلدی سے لپکے اور اسلام آباد والے بھائی کے مُنہ پر رکھا ہوا ہاتھ اسٹیج سیکرٹری صاحب کے مُنہ پر رکھ دیا۔ وہ بیچارے دَم گھُٹنے کی وجہ سے اُوں اُوں کر رہے تھے، اِدھر ہم اعلان کر رہے تھے: "حاضرین اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں، آپ کے لئے یہیں چائے آجائے گی۔" ہمارے اِس اعلان پر جو موٹے تازے اور تگڑے قسم کے حاضرین تھے وہ تو پھیل کر بیٹھ گئے اور جو ہم ایسے دُبلے پتلے کمزور حاضرین تھے وہ اُکڑوں ہوتے چلے گئے۔ جب ہم نے دیکھا کہ حاضرین اس طرح بیٹھ گئے ہیں کہ اُن کے سامنے چائے رکھی جاسکتی ہے تو ہم نے فوراً تالی بجا کر اپنے فرزندِ ارجمند کو اشارہ کرتے

ہوئے حکم صادر کیا کہ چائے حاضر کی جائے ۔۔۔ ہمارا یہ حکم سُنتے ہی ہمارا بیٹا جو ہمارے اشارے کا منتظر تھا، فوراً ہی چائے بھجوانے کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بیٹے کی اس پھُرتی اور سعادت مندی کو دیکھ کر ہمارا سر فخر سے اُونچا ہو رہا تھا۔ ہم نے اہلِ محفل پر اس خیال سے کہ وہ ہمیں داد دیں گے ایک بھرپور مسکراتی ہوئی نظر ڈالی، لیکن حاضرین میں سے کسی نے ہماری طرف دیکھا ہی نہیں، بلکہ چائے کے انتظار میں بہت سی نگاہیں دروازوں پر لگی تھیں کہ دیکھئے کس طرف سے چائے اور اُس کے لوازمات آتے ہیں اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے فرزندوں کے دوست چائے کے لوازمات اُٹھائے چلے آرہے ہیں، لیکن اندر آنے کے بجائے سیدھے باہر لان میں جا رہے ہیں۔ جب ان جوان دوستوں کی ایک قطار لان میں چلی گئی، تو ہمیں احساس ہوا کہ غالباً ہمارے بیٹے نے ہمارا حکم خود تو سُن لیا، لیکن اپنے دوستوں کو نہیں سُنایا؛ چنانچہ ہم بھاگ کر لان میں گئے۔ ہمارا خیال سو فیصد درست نکلا۔ ہم نے اِن جوانوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ چائے کا سامان اندر لے جاؤ، لیکن دیکھنا ہر چیز ایک جگہ ہی اکٹھی نہ کر دینا۔ سب نے سر جھکا کر اور یک زبان ہو کر "بہتر ہے جناب" کہا اور جہاں حاضرین بیٹھے تھے اُس طرف سامان لے کر چل پڑے۔ باہر لان میں ٹہل کر اور ٹھنڈی ہوا کھا کر ہمیں عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کی یہ تقریب بخیر و خوبی انجام کو پہنچ رہی ہے۔ ہم اس خیالِ تشکر میں مگن تھے کہ ہمارے ایک بیٹے نے آکر کہا: "ابا جان! حاضرینِ محفل نہ کچھ کھا رہے ہیں اور نہ چائے پی رہے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"غالباً وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آپ اُن سے یہ کہیں کہ چائے پینا شروع کریں۔

ہم نے بیٹے سے کہا: "دیکھا برخوردار! انسان پر شعر و ادب کا کتنا عمدہ اثر پڑتا ہے۔ کوئی اور محفل ہوتی، تو حاضرین ہرگز اس طرح میزبان کی اجازت کا انتظار نہ کرتے، بلکہ اب تک کھانے پینے کی چیزوں کو بھی کا چٹ کر گئے ہوتے۔ بہر حال حاضرین کو چائے پینے کے لئے کہنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ ابھی چل کر کہے دیتا ہوں۔" ہم یہ کہہ کر اندر حاضرین میں آئے تو

کیا دیکھتے ہیں سب ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے ہیں۔ ہم نے نہایت اعتماد اور مسرت کے ساتھ درخواست کی: "حاضرین اب کس بات کا انتظار ہے، جو کچھ حاضر ہے اُسے نوشِ جان فرمایئے۔"

"کیا حاضر ہے؟"

"جو کچھ بھی حاضر ہے۔"

"ارے بھائی کچھ حاضر ہو تو کھائیں، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔"

"کیا لڑکے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں لائے؟"

"کچھ لائے تو تھے۔ ایک دفعہ ایک کونے میں رکھ گئے۔ دوسری بار دوسرے کونے میں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک کونے سے آواز آئی: "بھائی صاحب لڑکے، پکوڑوں کی ایک ٹرے لے کر آئے تھے وہ ہم نے کھا لئے ہیں۔" دوسرے کونے سے یک لخت آواز بلند ہوئی: "ہائے ہائے مار ڈالا ... ہائے لوگو میں مرا ... کھوں ... کھوں ... کھانسی کی مسلسل آواز ... خدا کے لئے کوئی ایک گھونٹ پانی پلا دے۔" ہم گھبرا کر اُس کونے کی جانب گئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ نے ہری مرچوں کی بھری پلیٹ کو حلوہ سمجھ کر ایک چمچہ منہ میں ڈال لیا جس کی وجہ سے اُن کی حالت غیر ہو گئی، مگر ہماری سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی کہ پکوڑے ایک کونے میں اور چٹنی دوسرے کونے میں کس طرح پہنچ گئی۔ بڑے میاں کو پانی پلا کر اور اُن کے مُنہ میں میٹھے کی ایک چٹکی ڈال کر ہم دوسرے کونے میں پہنچے اور جو صاحبان یہ کہہ رہے تھے ہم نے پکوڑے کھا لئے، اُن سے عرض کیا: "حضرات! مذاق چھوڑیئے، بقایا پکوڑے دیگر حاضرین کے لئے بھی آگے بڑھا دیجئے۔" ہماری اِس درخواست پر پکوڑے کھانے والوں نے ایک زبان ہو کر کہا: "بھائی صاحب! ٹرے میں پکوڑے تھے ہی کتنے جو ہمارے کھانے کے بعد بچ جاتے۔ خود ہمارے حصے میں فی کس تین چار پکوڑوں سے زیادہ نہیں آئے۔"

ہم اپنا سا منہ لے کر اور اپنے بیٹوں پر غصہ کھاتے ہوئے باہر نکلے۔ سوچا یہ لحاظ

کرنا فضول ہے کہ ہمارے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ اُن میں سے جو بھی ہمارے سامنے آئے گا ہم سزا کے طور پر اُس کے ایک چپت یا مکّہ ضرور ماریں گے؛ چنانچہ باہر آتے ہی ہم نے دیکھا کہ ہمارا ایک برخوردار ہماری طرف پُشت کئے نہایت اطمینان سے کھڑا ہے۔ اُس کا یہ اطمینان دیکھ کر ہماری آتشِ غضب اور بھی بھڑک اُٹھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے درمیان ایک زور کا مکّہ جڑ دیا۔ ہمارا مکّہ پڑنا تھا کہ وہ دہرا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مگر جیسے ہی وہ گرا ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ ہمارا بیٹا نہ تھا، بلکہ ایک عزیز مہمان تھا جو غریب، انتظام میں ہمارے لڑکوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ہم اُس مہمان سے معذرت طلب ہوئے۔ پہلے چند لمحے تو بے چارے کو ہمیں معاف کرنے کی سُدھ بُدھ ہی نہ تھی، ہوش آیا تو اُس نے کہا:

"آپ میری فکر نہ کریں، اندر جائیں اور مہمانوں کو سنبھالیں۔" ابھی ہم اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارا ایک اور فرزند ڈرتے ڈرتے ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا:

"ابّا جان معاف کیجئے گا، آپ کے مہمان بہت بدتمیز ہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ کھانے یا چائے پینے کے بجائے آپس میں کھیل رہے ہیں۔"

"کھیل رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیا کھیل رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے جناب وہ کمرے کے اندر ہیں ہاکی، کرکٹ یا گُلی ڈنڈا تو کھیلنے سے رہے۔"

"پھر کیا تاش کھیل رہے ہیں؟"

"تاش تو نہیں کھیل رہے۔"

"آخر منہ سے کیوں نہیں بکتے۔ ارے کبڈّی کھیل رہے ہیں؟"

"ہم اس کھیل کو صحیح معنوں میں کبڈّی تو نہیں کہہ سکتے؛ البتہ کبڈّی کے لگ بھگ ضرور ہے۔"

"کیا فضول بک رہے ہو۔"

"اسی لئے تو عرض کر رہا ہوں کہ اندر تشریف لائیے۔" ہم اندر گئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ مہمان اپنے ہاتھوں میں ایک کے بجائے دو دو چمچے پکڑے ہوئے ہیں اور انہیں آپس میں بجا رہے ہیں۔ کچھ مہمانوں کے ہاتھ میں صرف چائے کی پیالیاں ہیں۔ کچھ کے ہاتھ میں صرف طشتریاں ہیں۔ کچھ مہمان نہایت اطمینان سے بیٹھے چینی پھانک رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ ہمارے منتظمین نے ایک جگہ چمچوں کا ڈھیر لگا دیا، تو دوسری جگہ صرف پیالیوں کا اور تیسری جگہ صرف طشتریوں کا۔ اگر ایک کونے میں چینی رکھ دی ہے، تو دوسرے کونے میں بسکٹ۔ جس کے قریب جو چیز ہے وہ اُسے لئے بیٹھا ہے اور جس صورت میں بھی اُس کا استعمال ممکن ہے وہ استعمال کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر جیسا ابھی عرض کیا گیا ہے جن کے قریب چمچے رکھے تھے انہوں نے چمچے اٹھا کر ہی بجانا شروع کر دیئے۔ بسکٹ والوں نے بسکٹ کھا کر ایک طرف کئے۔ باقی جن کے پاس بسکٹ نہیں تھے وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ اسی طرح ہمارے ان منتظمین نے مشرقی کونے میں چائے رکھ دی، تو مغربی کونے میں دُودھ۔ چائے والے دُودھ کو رو رہے ہیں اور دودھ والے چائے کو — ہم اپنی محفل اور اپنے مہمانوں کا یہ حال دیکھ کر سخت برہم ہوئے۔ انتہا درجے کے غصّے میں لال پیلے ہو کر باہر نکلے تھے کہ سامنے ہی بڑے فرزندِ ارجمند کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ ناراض ہو کر پُوچھا: "ارے یہ تم نے کیا گڑبڑ مچا رکھی ہے۔"

"ابا جان، کیسی گڑبڑ؟"

"اچھا جی تمہیں معلوم ہی نہیں۔"

"آپ نے ہی تو حکم دیا تھا کہ مَیں اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلوں؛ چنانچہ اُس وقت سے اسی جگہ کھڑا ہوں اور جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا مَیں نے سب کارکنوں کو ہدایت کر دی تھی کہ چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے نہ رکھنا۔"

"اچھا تو چیزوں کو الگ الگ رکھنے کے لئے تم نے ہی انہیں کہا تھا؟"

"جی ہاں مَیں نے ہی اُنہیں اس طرح کی ہدایت کی تھی۔" برخوردار نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

ہم نے شکریہ کے ساتھ کہا: "اسی لئے کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں ہے۔ چائے

مغرب میں ہے تو دُودھ مشرق میں۔ چمچے شمال میں ہیں، تو پیالیاں جنوب میں ــ اندر جاکر دیکھو ایک بڑبونگ مچی ہوئی ہے"۔ اتنی کھُلی اور واضح اجازت کے باوجود ہمارے سعادتمند برخوردار نے ہچکچاتے ہوئے پُوچھا! "کیا مجھے واقعی اندر جانے کی اجازت ہے"؟

"ہماری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جاؤ"۔ ہم نے غصّے میں آ کر کہا۔ اس پر برخوردار نے ذرا خفگی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: "دیکھئے نا ابا جان! ہم نے بیروں کی تربیت تو حاصل نہیں کی۔ یہ تو جس طرح آپ نے یہاں باہر اور امّی نے اندر حکم دیا، ہم اُس کی تعمیل کر رہے ہیں"۔

"گویا تم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو یہ سب ہماری غلطی ہے"۔

"میں اِس طرح کی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں!"

"ہم نے ہزاروں، بلکہ لاکھوں مرتبہ لوگوں کو ضیافتیں کھلائیں، عصرانے دیئے، لیکن اس طرح کبھی گڑبڑ نہیں ہونے دی"۔

"ضیافتیں اور عصرانے! ابا جان یہ کب کا ذِکر ہے"؟

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو"۔

ہماری یہ ڈانٹ سُن کر بیٹا جلدی سے اندر چلا گیا۔ ہم اپنی جگہ سخت غُصّے میں کھڑے تھے کہ شیخ مظہر اقبال ہمارے پاس کچھ کھاتے ہوئے آئے۔ کہنے لگے: "بھائی مشکور یہاں چھُپ کر کیوں کھڑے ہو"؟

"ارے بندہ ٔ خدا، گھر کے دروازے کے سامنے کوئی چھپ کر کھڑا ہوتا ہے"۔

"جی ہاں چھُپنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔ محفل اندر اور صاحبِ محفل باہر ہو، تو اسے چھپنا ہی کہا جائے گا ... بہرحال ..."

"بولتے کیوں نہیں، بہرحال کے بعد کچھ فرما کر میرے زخموں پر تم بھی نمک چھڑکو"۔

"توبہ توبہ ... میں تو پیارے داد دینے آیا تھا"۔

"کاہے کی"؟

"پکوڑوں کی ... بھئی قسم لے لو۔ بہت ہی عمدہ اور لذیذ پکوڑے تھے"۔

"مگر تھے کم :"

"کون کہتا ہے کم تھے۔ بہت تھے، بلکہ اتنے بہت کہ شاید ابھی بچے پڑے ہوں :"

" واقعی ؟" ہم نے غصّہ دُور کر کے اور خوش ہو کر پُوچھا۔

مظہر نے جواب دیا:" اور کیا مَیں جھوٹ بول رہا ہوں ؟"

" مگر جب میں پہلی مرتبہ اندر گیا تھا اُس وقت تو ایک ہی ٹرے پہنچی تھی اور وہ ختم ہو چکی تھی :"

" نہیں اس کے بعد کئی ٹرے آئیں :" یہ سُن کر ہمارا سر ایک دفعہ تو فخر سے بلند ہوا اور دوسری مرتبہ ندامت سے جُھکا۔ ہم جو دل ہی دل میں اب تک اپنی بیوی اور بچوں کو بُرا بھلا کہے جا رہے تھے اُس پر ہمیں سخت شرمندگی ہوئی۔ ہم بھی کیسے زُود رنج واقع ہوئے ہیں۔ گھر والوں کی غلطی تو بڑی بات ہے اُن سے غلطی کا تصور وابستہ کر کے بھی آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری کتنی بڑی نامعقولیت ہے۔ واقعی بیوی سچ کہتی ہیں کہ یہ اُنہی کا دل گردہ ہے جو ہمارے ساتھ نباہ کر رہی ہیں، ورنہ کوئی دوسری ہوتی، تو کبھی کی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہوتی۔ ہمیں اس طرح خیالات میں غرق دیکھ کر مظہر بولے "بھائی مشکور آپ کہاں گم ہو گئے ہیں ؟"

" نہیں... نہیں... بھائی... مَیں سو فیصد آپ کے پاس ہوں۔ ہاں تو آپ فرما رہے تھے پکوڑے بہت مزے دار تھے"۔

"جی ہاں مزے دار تو تھے... لیکن..."

" لیکن کیا ؟"

" پکوڑوں کے اندر آپ نے کیا ڈلوایا تھا ؟"

" بھئی تم جانتے ہو ہماری نئی ملازمہ پکوڑوں کی ماہر ہے عجیب عجیب تجربے کرتی رہتی ہے۔ پچھلی دفعہ پکوڑوں میں بینگن ڈال کر کھلائے، تو ہم سمجھے مچھلی ڈالی ہے۔ اس مرتبہ سبزیاں نہیں ڈالی ہوں گی، کسی نئی چیز کا تجربہ کیا ہوگا ؟"

" ایسا ہی معلوم ہوتا ہے :"

" آپ نے کیا محسوس کیا ؟"

"میرے پاس پہلے پکوڑے میں ایک جانور تھا۔"

"جی؟"

"جی ہاں"۔ مظہر کی "جی ہاں" پر ہم نے ہنس کر کہا "ملازمہ کا یہی کمال ہے۔ آپ سمجھتے کچھ ہیں، لیکن پکوڑوں میں ہوتا کچھ اور ہے۔"

"معاف کیجیے بھائی! میں اندھا نہیں ہوں۔ میرے پہلے پکوڑے میں جو جانور تلا گیا تھا وہ کاک روچ تھا۔"

"کاک روچ؟"

"بالکل کاک روچ، بلکہ مکمل کاک روچ اپنے لال پَروں اور لمبی ٹانگوں سمیت۔"

"میرے پیارے! یہی تو کمال ہے۔ آپ اُسے کاک روچ سمجھ رہے ہیں۔ وہ یقیناً سبزی ہوگی۔"

"بہت خوب۔ گویا ایسی بھی کوئی سبزی ہے جس کے پَر بھی ہوتے ہیں اور ٹانگیں بھی؟"

"یہ ناممکن تو نہیں۔"

"اور پھر یہ سبزی ٹانگیں بھی چلاتی ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ گرم گرم ہونے کی وجہ سے میں نے پکوڑا کھولا، تو اُس میں کاک روچ آخری دموں پر تھا اور اُس کی ٹانگیں ہل رہی تھیں۔"

"مظہر بھائی، خدا کا خوف کرو، تیل میں تلے جانے کے بعد بھی کوئی جانور زندہ رہ سکتا ہے؟"

"یہ کاک روچ جسے عرفِ عام میں تل چٹا کہتے ہیں بڑا ڈھیٹ جانور ہے۔"

"چلو بھائی مان لیتا ہوں پہلے پکوڑے میں کاک روچ تھا، دوسرے میں تو کچھ نہیں نکلا۔"

"ماشاء اللہ دوسرے پکوڑے میں کانچ کی گولی جسے بچے بنٹا کہتے ہیں، بڑی صفائی سے تلی گئی تھی۔"

"وہ آپ کی اس توند میں چلی گئی۔" میں نے مظہر کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اُس نے جواب دیا "آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ گولی میرے

پیٹ میں نہیں گئی، کیونکہ دوسرا پکوڑا اُٹھانے کی ہمت ہی مجھ میں نہ تھی اُسے میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اُٹھایا اور فی الفور اپنے منہ میں رکھ لیا، مگر دوسرے لمحے ہی کھٹاک کی آواز آئی اور ساتھ ہی بڑے میاں چلائے: "ہائے میرا دانت" اور بڑے میاں کا دانت اُن کے ہاتھ میں تھا۔"

"وہ بڑے میاں کہاں ہیں؟" ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یقین نہ آئے، تو اندر جا کر دیکھ لو ابھی تک پانی کی کلیاں کر رہے ہیں۔"

"باقی پکوڑے تو ٹھیک ٹھاک رہے؟"

"میرے برابر بھی ایک بوڑھے صاحب ہی بیٹھے تھے۔ تیسرا پکوڑا انہوں نے اُٹھایا، لیکن وہ اُسے منہ میں ڈالنے ہی والے تھے کہ نجانے انہیں کیا خیال آیا۔ فوراً پکوڑے کو اپنی چُندھی آنکھوں کے قریب لا کر مجھ سے کہنے لگے: "کیوں بیٹا، ذرا اِس پکوڑے کو دیکھنا، یوں لگتا ہے جیسے اِس میں مونچھیں اُگ آئی ہیں۔"

"پھر آپ نے اس پکوڑے کو دیکھا؟" ہم نے قدرے گھبرا کر دریافت کیا۔

"جی ہاں دیکھا۔" مظہر بولے۔

"وہ پکوڑا تو ٹھیک ہی ہو گا۔ اِن بوڑھوں کی آنکھیں بھی عجیب عجیب جلوے دکھاتی ہیں۔"

"مگر اُن بڑے میاں کی آنکھوں نے تو کوئی عجیب جلوہ نہیں دکھایا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ اُس پکوڑے میں ایک عدد جھینگر تلا گیا تھا۔ لیکن اس مہارت کے ساتھ کہ جھینگر اور اُس کا جسم تو پکوڑے کے اندر تھا، مگر مونچھیں پکوڑے کے باہر صحیح سلامت موجود تھیں، یعنی اُن مونچھوں کا ذرا بال بیکا نہ ہُوا تھا۔"

ہم ابھی مظہر صاحب کی اِن باتوں سے اپنا خُون کھولانے میں مصروف ہی تھے کہ مولانا افسر عباس اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر نکلے۔ ہم نے سوچا اب یہ حضرت ہماری خبر لیں گے اور طنز کے تیر چلائیں گے، لیکن انہوں نے آتے ہی فرمایا: "بھئی مشکور صاحب! سبحان اللہ! کیا عمدہ دودھ پلایا آج آپ نے۔ بھلے آدمی، اتنے تکلف کی بھی

کیا ضرورت تھی۔ سب شاعروں کے لئے دودھ کا انتظام کر ڈالا؛ حالانکہ میرے سوا تمام شاعر چائے پینے کے عادی ہیں۔ وہ بے چارے شرما شرمی سر جھکائے دودھ پیتے رہے اور یہی کہتے رہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر چائے بھی آجاتی۔"

"کیا آپ کی طرف چائے نہیں آئی؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"آپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ چائے کا انتظام ہے۔"

"یہ تو معلوم تھا۔"

"پھر مولانا نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے تعلقات گھر کے سے ہیں۔ آپ نے خود اُٹھ کر شاعروں کو چائے کیوں نہ پلا دی۔"

"بھئی میں کیسے پلا دیتا۔ بس اسی خیال میں رہا کہ آپ نے شعرا کے ساتھ خصوصی رعایت فرمائی ہے۔"

"مگر شاعروں تک دودھ پہنچا کیسے؟"

"اس کے لئے میں ضرور گناہ گار ہوں۔ میں نے آپ کے بیٹے سے صرف اپنے لئے دودھ منگایا تھا غالباً وہ بھلا آدمی یہ سمجھا کہ جملہ شعرا چائے نہیں پیتے؛ لہٰذا سب کے لئے دودھ بھیج دیا۔"

"پھر تو دوسرے بہت سے لوگوں تک وہ پہنچا ہی نہ ہو گا۔"

"جی ہاں، اندر دودھ لاؤ... دودھ لاؤ کا شور مچا ہوا ہے۔"

یہ سن کر مظہر کہنے لگا، "میں اندر جا کر جملہ حاضرین کو چائے پینے سے روکتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" مولانا نے پوچھا۔

مظہر نے جواب دیا، "شاید آپ کو یاد نہیں رہا ابھی تو دو آئیٹم باقی ہیں۔"

ہم نے پوچھا، "وہ کون سے؟"

"ایک چرغہ۔ دوسرے کیک پیسٹری۔"

"دیکھو مظہر، ہمارا مذاق نہ اُڑاؤ۔ بقولِ غالب "مفلسوں کا مدارِ حیات حسنِ خیال پر ہے۔" ہمارا

جی یہی چاہتا تھا کہ ہم اپنے مہمانوں کو بہترین سے بہترین چیز کھلائیں، لیکن جیب اجازت نہ دے، تو کیا کریں؟" ہم نے اپنا یہ فقرہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ مہمانوں کا ایک ریلا ہمارے دروازے توڑتا ہوا نکلا۔ سب کی زبان پر تھا: "ہم ایسی چائے پر لعنت بھیجتے ہیں جس کے لئے نہ دُودھ ہے اور نہ چینی۔ لاحول ولا قوۃ ... لاحول ولا قوۃ ... اب کبھی ایسی محفل میں نہ آئیں گے۔"

ہم اُس وقت اپنے موٹے سے یار مظہر کے پیچھے چھُپے کھڑے تھے۔

لاحول ولاقوۃ

"لاحول ولاقوۃ"۔

"چٹ چٹاچٹ ۔ چٹاچٹ . . ."

"لاحول ولاقوۃ . . ."

"چٹاچٹ ۔ چٹاچٹ"

"لاحول ولا . . . ."

برابر کے مکان سے مسلسل لاحول پڑھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ مُنہ پر چپت پڑنے کی چٹاخ پٹاخ بھی سُنائی دے رہی تھی ۔ مَیں نے سلیمہ بھابی سے پُوچھا: "یہ کیا معاملہ ہے؟" کہنے لگیں "بھائی جان! کچھ مت پُوچھئے، ہمارے پڑوس میں ایک بزرگ حاجی صاحب رہتے ہیں، اس وقت وہ استغفار میں مصروف ہیں۔"

"استغفار؟"

"جی ہاں شیطان کو دُور بھگانے کی کوشش کرنا بھی استغفار کی ایک صورت ہے خصوصیت کے ساتھ بُڑھاپے میں۔"

"وہ کیسے؟"

"دیکھئے نا ۔ جوانی میں اگر آدمی شیطان کو بھگانا چاہے تو واقعی بھگا سکتا ہے، لیکن بڑھاپے میں اسے بھگانا اتنا آسان کام نہیں، اس زمانے میں بھاگنے کے بجائے وہ مزید انسان کی گردن پر سوار ہو جاتا ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں لاحول پڑھنا بھی مغفرت چاہنے کے مترادف ہے۔"

اگرچہ بھابی نے اپنی دانست میں بڑی وضاحت کے ساتھ بات کی تھی، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میَں خاموش ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ شیو بنانے اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد ناشتہ کرنے بیٹھا تو برابر کے مکان سے لاحول کی آوازیں پھر اُسی شان و شوکت کے ساتھ بلند ہوئیں، میرا مطلب ہے لاحول بھی پڑھی جا رہی تھی اور چپت بھی لگائے جا رہے تھے۔ میَں نے بھابی کی طرف مُسکرا کر دیکھا۔ بھابی بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں مُسکرا دیں۔ فہیم بولا؟ "کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے بھائی اور بھابی میں چُپکے چُپکے کیا اشارے ہو رہے ہیں"۔

"بس اشارے ہی ہو رہے ہیں، اِن اشاروں کے مفہوم سے یہ بندۂ ناچیز ابھی تک نا آشنا ہے"، میَں نے اپنے دوست فہیم کو جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"کیا مطلب ہے"، اُس نے پُوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ مجھے اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ ساتھ والے مکان میں ایک حاجی صاحب رہتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ لاحول پڑھتے ہوئے اپنے گالوں پر چپت مارتے ہیں، لیکن ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ابھی تک پتہ نہ چل سکا ہے"۔

"آپ عین الیقین چاہتے ہیں یا علم الیقین ہے"، فہیم نے مجھ سے پُوچھا۔

"گویا آپ ہمیں حقیقت کا نظارہ بھی کرا سکتے ہیں ہے"

"جی ہاں"۔

"تو پھر اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے"۔

"ایسا ہے تو اُٹھیے ذرا دیوار کے پاس آئیے"۔

"کیوں سر پھڑوانے کا ارادہ ہے کیا ہے"

"ایسی بات نہیں ہم دونوں میاں بیوی نے عین الیقین حاصل کرنے کے لئے دیوار میں ایک روزن کر رکھا ہے یا یُوں کہہ لیجئے قدرت نے خود بخود ہمارے لئے یہ انتظام فرما دیا ہے"۔

"مگر یہ تو کوئی اچھی بات نہیں"۔

"پیارے! تکلف چھوڑو۔ روزنِ دیوار تو ہماری اُردو شاعری کی روایت میں داخل ہے"۔

حاجی صاحب کے لاحول پڑھنے اور چپت لگانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے روزنِ دیوار سے اپنی ایک آنکھ کی نشست باندھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ حاجی صاحب کبھی دائیں ہاتھ سے اپنی ناک پکڑتے ہیں تو بائیں سے گالوں پر چپت مارتے ہیں کبھی بائیں سے ناک پکڑتے ہیں تو دائیں سے چپت لگا رہے ہیں۔ ہم نے کچھ دیر یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر عرض کیا: "بھئی اتنا تو ہمیں آوازیں سُن کر بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی لاحول پڑھ رہا ہے اور اپنے مُنہ پر طمانچے بھی مار رہا ہے لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے اس کا علم ابھی تک نہیں ہو سکا۔"

"آپ نے صرف حاجی صاحب کو دیکھا اور کچھ نہیں دیکھا"، فہیم نے دریافت کیا۔

"اور کچھ کیوں نہیں دیکھا — ایک چارپائی دیکھی جس پر بیٹھے حاجی صاحب اپنے آپ کو یہ سزا دے رہے ہیں اور تمہاری بیوی کے بقول استغفار فرما رہے ہیں۔ اُن کے قریب ہی غالباً ایک سُرمہ دانی مع ایک عدد سُرمچو رکھی ہے۔ آئینہ بھی ہے۔ مہندی کی پُڑیا بھی موجود ہے۔ حاجی صاحب قبلہ کے گلے میں موٹے دانوں کی تسبیح ہے۔ ہاں ایک عدد عصا بھی چارپائی کے نیچے پڑا ہے۔ اُسی کے قریب ایک لوٹا رکھا ہے۔ اور . . . اور . . ."

"بس بس ادیب صاحب آپ نے تو پورے گھر کا ساز و سامان ہی گنوانا شروع کر دیا میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔"

"پھر تمہارا مطلب کیا تھا؟"

"مَیں تو یہ پُوچھ رہا تھا کہ آپ نے حاجی صاحب کے علاوہ کسی فرد بشر کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں!" ہمارے مُنہ سے ابھی لفظ نہیں اچھی طرح برآمد نہ ہوا تھا کہ حاجی صاحب کے مکان سے نہایت دِل آویز اور فردوسِ گوش قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں — حقیقت یہ ہے کہ یہ قہقہے بہت ہی خوش آئند اور مسحور کُن تھے — ایک بار تو ہم بھی سحر زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ فہیم نے ہماری طرف مُسکرا کر دیکھا۔ ہم نے کہا: "اے عزیزِ باتمیز جلدی بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے؟" کہنے لگا: "اب آپ عرفان کی منزل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔"

ہم نے کہا: "دیکھو جانِ من! دل لگی جانے دو۔ صاف طور پر بتاؤ کہ ان قہقہوں کی خالق کون خوش فطرت ہستیاں ہیں؟"

"یہ دونوں ہی حاجی صاحب کی جوان بھتیجیاں ہیں"۔

ابھی ہم لوگ یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اُدھر جیسے جیسے نقرئی قہقہوں کی رفتار تیز ہوئی اُسی نسبت سے حاجی صاحب کے لاحول کی گردان اور طمانچوں کا طوفان تیز تر ہوتا چلا گیا۔ مَیں نے پھر اپنے دوست فہیم سے پُوچھا "کیا یہ لڑکیاں حاجی صاحب سے مذاق کرتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں"۔

"کیا یہ گستاخ ہیں"۔

"بالکل نہیں"۔

"تو پھر کیا ماجرا ہے" مَیں نے تنگ آکر پوچھا۔

فہیم بولا "دراصل یہ بات شنید سے زیادہ دید سے تعلق رکھتی ہے؛ چنانچہ آپ یہاں گھر میں تشریف رکھیئے۔ وقتاً فوقتاً روزنِ دیوار سے کام لیجیے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آجائے گا"۔

"تم کیوں نہیں بتا دیتے"۔

"یہ ذرا تفصیل طلب قِصّہ ہے اور مجھے اِس وقت ایک دوست سے ملنے جانا ہے"۔

فہیم خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔

مَیں نے سوچا چلو آج حاجی صاحب کی شخصیت ہی کا مطالعہ کرتے ہیں، ممکن ہے کوئی دلچسپ بات ہاتھ لگ جائے۔ ہرچند کہ روزنِ دیوار سے کسی کے گھر میں جھانکنا کوئی عمدہ اخلاقی فعل نہیں ہے۔ پھر بھی معلومات کی خاطر ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؛ چنانچہ میں سراپا گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ پہلے دس منٹ گذرے، پھر پندرہ حتیٰ کہ آدھ گھنٹہ گزر گیا، لیکن حاجی صاحب کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ مَیں نے اُکتا کر سوچا کس فضول مشغلے میں خود کو پھنسا لیا ہے۔ شجاع آباد آیا ہوں تو یہاں کی کچھ سیر ہی کر لی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی مَیں نے پاؤں میں جوتا ڈالا اور چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ حاجی صاحب کی آواز بلند ہوئی "اے مہ جبیں! اے نیلوفر! اری لڑکیو تم کہاں ہو"۔ بھابی نے رازدارانہ انداز میں مُجھ سے کہا "بھائی صاحب کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ حقیقتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کا ابھی تو موقع آیا ہے"۔

"پھر؟"

"اِدھر روزنِ دیوار کی طرف تشریف لائیے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے میں ان لڑکیوں کو دیکھوں؟"

"اس میں کیا مضائقہ ہے؟"

"ایک تو دوسرے کے گھر میں جھانکنا اور پھر پردہ نشینوں کو تاکنا اپنی تو سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔"

"یہ پردہ نہیں کرتیں۔ ویسے آپ کی مرضی ہے میں آپ کو مجبور نہیں کر رہی ہوں۔"

میں روزنِ دیوار کی طرف روانہ ہوا تھا کہ حاجی صاحب کی پھر آواز آئی "مہ جبیں! ۔نیلوفر! ارے تم لوگ آخر ہو کہاں؟" روزن دیوار میں آنکھ فٹ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حاجی صاحب اپنی اُسی پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کے پیچھے دو چاند کے ٹکڑے کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ اِن دونوں کے درمیان حاجی صاحب کالے اودے بادل کا ایک ٹکڑا نظر آ رہے تھے۔ یا اللہ میاں کس قدر حسین لڑکیاں ہیں۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اُدھر جیسے ہی حاجی صاحب نے دوبارہ مہ جبیں اور نیلوفر کی آواز لگائی۔ پہلے ایک لڑکی نے حاجی صاحب کے دائیں کان کے قریب کہا "جی چاچاجی فرمایئے۔" پھر دوسری لڑکی نے اس عمل کو دہرایا۔ ساتھ ہی حاجی صاحب چونک کر اُچھلے اور پھر اُنہوں نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ "ہائے ہائے کیا خوشبو ہے۔ مگر لاحول ولاقوۃ۔ . . لاحول ولاقوۃ. . . ذرا مجھ سے دُور رہو. . . دُور ہو جاؤ . . . لاحول ولاقوۃ. . . لاحول ولاقوۃ. . . یا اللہ میری توبہ". . . اس کے بعد حاجی صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کان اتنے زور سے کھینچے کہ وہ سُرخ ہو گئے۔ میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا — دونوں لڑکیاں حاجی صاحب کے پیچھے کھڑی مُنہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے روزن دیوار سے علیحدہ ہو کر سلیمہ بھابی سے کہا "بھئی آپ بتاتی کیوں نہیں یہ کیا قصّہ ہے؟"

"بس بھائی صاحب دیکھتے جایئے۔"

"کیا دیکھتا جاؤں؟"

"جو کچھ بھی نظر آئے۔"

"لیکن کچھ سمجھ میں بھی تو آئے۔"

"سمجھ میں تو ہمارے بھی آج تک نہیں آیا، ممکن ہے آپ کی سمجھ میں کچھ آجائے، دانشور جو ہوئے۔"

"فی الحال تو عزیب دانشور کی دانشوری اُلٹی لٹکی ہوئی ہے۔"

"اُلٹا لٹکانے کے بجائے اسے سیدھا رکھیں گے تو یقیناً کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"بھئی آپ میری کچھ مدد تو فرمائیں۔"

"بھائی صاحب آپ نے بھی کمال کر دیا۔ جیتا جاگتا کھیل آپ کو دکھایا جا رہا ہے۔ آپ پھر بھی گلہ گزار ہیں۔"

"کیا ہر وقت حاجی صاحب اسی طرح لاحول پڑھتے رہتے ہیں؟"

"قریب قریب۔"

"پھر تو بے چارے عجیب مصیبت میں مبتلا ہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں ان سے زیادہ بے چاری یہ لڑکیاں گرفتارِ بلا ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ ذرا کھڑی ہوتی ہیں تب حاجی صاحب لاحول پڑھتے ہیں، یہ بیٹھتی ہیں تب لاحول پڑھی جاتی ہے۔ یہ چلتی ہیں تب لاحول کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ لیٹتی ہیں تب لاحول، کروٹ لیتی ہیں تب لاحول غرض ان کی کونسی بات، کونسی ادا ہے جس پر حاجی صاحب لاحول نہیں پڑھتے۔"

"مگر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"اب یہ تو آپ حاجی صاحب ہی سے دریافت فرما سکتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کو کچھ پتہ نہیں؟"

"بس یونہی سمجھ لیجئے۔"

"آخر پھر بھی..."

"قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی اس کے قائل ہیں کہ ہر بات کی تہ تک پہنچنا ضروری نہیں۔ بعض اوقات صرف ظاہر سے بہت کچھ لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم حاجی صاحب اور اُن کی دومہ لقا عزیزاؤں کو دیکھتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں۔"

"مثلاً آپ لوگوں نے کیا کچھ دیکھا؟"

"بہت کچھ۔"

"اُس میں سے کچھ ہمیں بھی تو بتائیے۔"

"سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔"

"یہ بات ہے تو سب کچھ بتا ڈالیے۔"

"خیر اس کے لئے تو بہت وقت درکار ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"واہ گویا آپ ہمارے پاس حاجی صاحب کی باتیں ہی سُننے کے لئے آئے ہیں۔"

"بہرحال جو بات اس وقت یاد آرہی ہے وہی سُنا ڈالیے۔"

"مثلاً ابھی دو چار روز پہلے کی بات ہے حاجی صاحب کی بڑی بھتیجی مہ جبیں اُن کے سامنے سے ذرا اِٹھلا کر گذری تو بس قیامت آگئی۔ حاجی صاحب نے ایک دم لاحول پڑھنا شروع کر دیا اور اپنے مُنہ پر چپت بھی مارنے لگے ساتھ ہی کہتے جاتے تھے۔ "سُبحان اللہ کیا چال ہے۔۔۔ مگر نہیں لاحول ولاقوۃ کوئی چال نہیں۔۔۔ چال تو ہے۔۔۔ نہیں کوئی چال نہیں. لعنت ہے۔۔ چٹاخ۔۔۔ چٹاخ۔۔۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔ اس کم بخت غالب نے کیا کہا تھا۔۔ "میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا" مگر توبہ توبہ اے حاجی تجھ پر ستر ہزار بار لعنت۔ ارے او فاسق و فاجر انسان اُس شعر کا پہلا مصرعہ تو بہت خطرناک ہے۔ کیا تھا بھلا وہ مصرعہ۔ ہاں۔۔۔ "جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم"۔۔ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا"۔ دُور پھٹے مُنہ بے حیا کہیں کے تو اپنی لختِ جگر مہ جبیں کو یار بنا رہا ہے۔۔۔ تڑاخ۔۔۔ پڑاخ۔۔۔ ٹھاں۔۔۔ ٹھپ۔۔۔" اس کے بعد حاجی صاحب نے اپنا ایک کان پکڑ کر کہا۔ "بول اب سے اپنی مہ جبین کی طرف دیکھے گا۔۔۔ نہیں دیکھوں گا۔۔۔ تو جھوٹ بولتا ہے۔ کمینے مجھے معلوم ہے تو پھر دیکھے

گا ... چٹاخ ... پٹاخ ... تڑاخ ... اور اس کے بعد حاجی صاحب نے خوب اپنی پٹائی کی۔ اور لاحول بھی پڑھی۔"

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ حاجی صاحب بڑے بدمعاش آدمی ہیں۔"

"ارے نہیں بھیّا ایسا ہرگز نہیں۔ حاجی صاحب بہت نیک اور شریف آدمی ہیں۔"

"وہ کس طرح ؟"

"وہ اس طرح کہ یہ تعویز گنڈا بھی کرتے ہیں۔ اس کے لئے ان کے پاس بہت سی خواتین آتی ہیں۔ اُن کی طرف انہوں نے کبھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔"

"بگلا بھگت جو ہوئے۔"

"نہیں یہ بات بھی نہیں ہے۔ آج تک کبھی کوئی ایسا ویسا واقعہ اُن سے منسوب سُننے میں نہیں آیا۔"

"آپ یہ وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہیں ؟"

"ہمیں یہاں رہتے ایک سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں اس طرح کی بات کبھی چھُپی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں حاجی صاحب ویسے بھی بہت ہمدرد اور مخیّر آدمی ہیں محلّے میں شاید ہی کوئی اُن کے احسان سے بچا ہو گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو انہیں گھر میں آ کر کیا ہو جاتا ہے ؟"

"یہی تو سوال ہے جس کا جواب آپ ایسے سوچنے سمجھنے والے آدمی کو دینا چاہیئے۔"

"اِس وقت تو مجھے اپنی سوچ اور سمجھ دونوں ہی پر بقول یا بقلِ حاجی صاحب لاحول پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ ... لاحول ولا قوۃ ... تڑاخ ... پڑاخ ... یہ لیجئے حاجی صاحب نے پھر لاحول پڑھنا اور اپنے مُنہ پر چپت لگانا شروع کر دیا۔" سلیمہ بولیں۔

"اب انہیں کیا ہو گیا ہے ؟" مَیں نے پُوچھا۔

"روزنِ دیوار سے مدد لیجئے"۔۔ پتہ چلا کہ حاجی صاحب نگاہیں نیچی کئے آرام سے بیٹھے تھے کہ اُن کے قریب سے دو خوبصورت پاؤں گُدزے گورے چِٹّے بھرے بھرے، نہایت تناسب

انگلیاں، ناخنوں پر سلیقے سے پالش لگی ہوئی — حاجی صاحب نے آواز لگائی "مہ جبیں! بیٹا دیکھو کوئی محترمہ تمہارے پاس آئی ہیں۔" اس کے جواب میں وہ دو پاؤں وہیں ٹھہر گئے مہ جبیں نے کہا "چاچاجی! باہر سے کوئی محترمہ نہیں آئی یہ تو میں ہوں" یہ سنتے ہی حاجی صاحب نے اپنا منہ پیٹ لیا اور لاحول کی گردان شروع کر دی۔

"معاملہ خاصا پیچیدہ ہے" میں نے بزعمِ خود بہت سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے سلیمہ بھابی کو مخاطب کر کے کہا:

"میرے خیال میں ایسا کوئی خاص پیچیدہ بھی نہیں ہے" سلیمہ بولیں:

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ مجھے ناحق پریشان کر رہی ہیں بتا کیوں نہیں دیتیں"

"بھائی صاحب آپ ادیبوں اور دانشوروں سے خوف آتا ہے۔ یہ جس طرح بال کی کھال نکالتے ہیں ہم عام آدمی ایسا کرنے کے عادی نہیں ہوتے ہم تو معاملہ کو براہِ راست سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی بات کو اُلجھانے کے لئے وقت نہیں ہوتا"

"بھابی صاحبہ آپ خود کیا کم پڑھی لکھی ہیں ویسے آپ نے مجھے کہاں کا دانشور اور ادیب سمجھ لیا۔ میں ہار مانتا ہوں آپ حاجی صاحب کی بات کریں"

"جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکی ہوں حاجی صاحب کچھ زیادہ ہی نیک اور شریف آدمی واقع ہوئے ہیں"

"جبھی تو بھتیجی کے پاؤں دیکھ کر بدک جاتے ہیں"

"سُنیئے تو سہی"

"فرمایئے"

"میں آپ کو اپنے تجربے کی بات بتاتی ہوں"

"بہت خوب"

"میں جس وقت پندرہ سولہ سال کی ہوئی میں نے اپنی آواز میں خاص انداز کا رکھ رکھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے باعث میری عام بول چال میں ایک خاص طرح کا اسلوب پیدا ہو گیا۔ مثال کے طور پر میں ہائے کو ہائیں کہنے لگی اور جی کو جیں۔ ہنستے ہوئے بھی ہا ہا کے

بجائے ہاں ہاں کر کے ہنستی۔ گویا میرے لہجے اور آواز میں نون غنّہ حلول کر گیا۔ دوسرے لفظوں میں یُوں سمجھیے میری آواز زکام زدہ ہوگئی یا نزلائی گئی — میری اس زکام زدہ آواز کو خاندان کے تمام افراد پسند کرتے تھے، لیکن ابّا جان کو میری یہ آواز قطعی ناپسند تھی۔ مجھے اس طرح بولتا سُن کر اُن کی تیوری پر بے شمار بل پڑ جاتے۔ اسی طرح میں جب خاص انداز سے چل کر اُن کے سامنے سے گذرتی تو وہ میری اِس کوشش پر بھی خوش نہ ہوتے اور میرا میک اَپ کرنا تو اُنہیں ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔"

"اِس کا یہ مطلب ہوا..." مَیں نے لقمہ دینا چاہا، مگر سلیمہ بھابی نے درمیان ہی میں روک دیا اور کہنے لگیں:

"اب آپ خواہ مخواہ کوئی نتیجہ نہ نکال لیجئے پہلے میری بات مکمل ہونے دیجئے۔"

"میں خاموش ہوں۔"

"اُس وقت تو ابّا جان کا یہ رویّہ مجھے بُرا لگا، لیکن بعد میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ اُن کی یہ ناراضی اتنی بے محل بھی نہ تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ جانتے ہیں نوجوانی میں ہر مرد و زن شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی جنسی کشش کو دوبالا کرنا چاہتا ہے مَیں اِسے ایک فطری عمل قرار دے سکتی ہوں، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اِس کے لئے موقع و محل کا لحاظ کرنا لازمی امر ہے — بزرگوں بخصوصیت کے ساتھ والدین کے سامنے اولاد کو زیادہ بن سنور کر نہیں آنا چاہیئے۔"

"یہ تو بہت بڑی قدغن ہے۔"

"اتنی بڑی نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ صرف شادی تک کے لئے اِس احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"شادی کے بعد نہیں۔"

"میرا تجربہ تو یہی کچھ بتاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"شادی کے بعد ابّا جان نے میری زکام زدہ آواز پر کبھی تیوری نہیں چڑھائی"۔

"آپ نے اپنے ابّا کی ناراضی کے باوجود آواز کا وہی انداز رکھا؟"

"جی ہاں صرف اُن کے سامنے احتیاط کرتی تھی"۔

سلیمہ بھابی نے قدرے شرما کر جواب دیا "وہ تو سب سے پہلے میری آواز کے اِسی انداز پر فریفتہ ہوئے تھے"۔

"بہت خوب ـــ دوسری کس بات پر فہیم نے آپ کو دل دیا تھا"۔

"ارے بھیّا چھوڑیئے اِن باتوں کو۔ یہ ہماری پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں"۔

"تو پھر حاجی صاحب کی طرف آجایئے"۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے حاجی صاحب نے خاصے کٹّر مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے ان کی جنسی زندگی بھی گھٹن کا شکار رہی"۔

"یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟

"اپنی بھتیجیوں کی ذرا ذرا سی بات پر اِن کے لاحول پڑھنے سے ۔ آپ نے غور نہیں فرمایا ابھی کچھ دیر پہلے . . ."

"کیا؟"

"لڑکیوں نے اِن کے کان کے قریب آکر جو بات کی تو پاؤڈر یا لپ اسٹک کی خوشبو سے حاجی صاحب پریشان ہو گئے اور لگے لاحول پڑھنے"۔

"آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح حاجی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں"۔

"خیر جذبات برانگیختہ ہونے والی بات تو میں نہیں کہہ سکتی"۔

"کیوں؟"

"بھائی صاحب! بچّوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ بھتیجیوں کو دیکھ کر چچا کے جذبات توخدا نہ کرے کہ برانگیختہ ہوتے ہوں، البتہ اس کا اندیشہ ضرور ہو سکتا ہے اور غریب حاجی صاحب اسی اندیشہ کے تحت لاحول کا وِرد کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اُن کی یہ دونوں بھتیجیاں بھی کچھ

ناسمجھ ہیں۔"

"اُن کی ناسمجھی کیا ہے؟"

"یہی کہ وہ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہیں۔ یہ تو خدا کا شکر کیجئے کہ زیادہ فیشن ایبل نہیں، ورنہ قیامت ہی آجاتی۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی دو تین ہفتے کی بات ہے ایک روز حاجی صاحب نے نہ صرف لاحول پڑھنی اور اپنے مُنہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیئے، بلکہ زور زور سے چیخنے اور چلّانے بھی لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکیوں نے چُست لباس پہن لیا تھا جس سے اُن کے جسم کی گولائیاں اور خطوط واضح ہو گئے، اُدھر حاجی صاحب کی نگاہ اچانک اُوپر اُٹھ گئی۔"

"غالباً حاجی صاحب نے میر انیسؔ کا یہ شعر نہیں سُنا ہوگا۔"

"کونسا شعر؟"

" پڑھیں دُرود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

"معاف کیجئے بھائی صاحب آپ حقیقی صورتِ حال کو ہمیشہ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ بھتیجیوں کی طرف دیکھ کر خیالِ صنعتِ صانع بھی نہیں آسکتا۔ کم از کم مشرقی تہذیب تو ہمیں بھی کچھ سکھاتی ہے۔ مجھے اِس وقت وہ حکم یا حدیث کے الفاظ تو یاد نہیں آرہے ہیں، لیکن اسلام میں بھی یہ تاکید ہے کہ ایک تو اپنے اعضاء کی نمائش نہ کرو، دوسرے ماں باپ اور جوان بھائی بہن سے تنہائی میں ملنے سے حتی الوسع گریز کرنا چاہیئے۔"

"بھائی آپ تو اچھے خاصے مولوی ہیں۔"

"معاف کیجئے ہمارے دانشوروں کا ایک غلط اندازِ فکر یہ بھی ہے کہ اوّل تو مذہب پر بات کرنا ہی اِن کے ہاں دقیانوسی ہونے کی دلیل ہے دوسرے اگر کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات کو مذاق میں اُڑا دیا جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں ہمیں حاجی صاحب کے مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور"۔۔۔ میں ابھی فقرہ

مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ حاجی صاحب کے گھر سے اِن لڑکیوں کے چیخنے کی آواز آئی۔ بھابی سلیمہ فوراً سیڑھی سے اُتر کر اُن کے ہاں پہنچ گئیں۔ انہوں نے جاتے ہی مجھے آواز دی: "بھیا جلدی سے آیئے"۔ مَیں حاجی صاحب کے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ زینے سے گِر کر لہولہان پڑے ہیں اور زبان پر وہی لاحول کا ورد جاری ہے۔ حاجی صاحب کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ اُن کے سَر اور بازو پر خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا؟ پُوچھنے پر پتہ چلا کہ وقوعہ سے پہلے مہ جبیں کی قمیص میں کوئی بھِڑ گھُس گئی تھی۔ اُسے نکالنے کے لئے مہ جبیں نے فوراً اپنی قمیص اُتاری۔ اِس پر بھی بھِڑ نہ نکلی تو اُس نے اپنا بنیان اُتار ڈالا۔ ابھی بنیان اُتارا ہی تھا کہ حاجی صاحب کی نظر مہ جبیں کے سینے پر پڑ گئی۔ نظر کا پڑنا تھا کہ حاجی صاحب لاحول پڑھتے ہوئے اور اپنا مُنہ پیٹتے ہوئے عجلت کے ساتھ زینے سے نیچے اُترنے لگے اور وہاں اُن کا پاؤں رپٹ گیا۔

اِس واقعہ کے بعد مَیں شجاع آباد سے واپس لاہور آگیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد بھابی سلیمہ کا خط آیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ حاجی صاحب ہسپتال سے گھر آ گئے ہیں لیکن اُنہوں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب وہ کبھی اُوپر کی منزل میں نہ آئیں گے اور نہ اُن کی بھتیجیاں پہلے سے اطلاع دیئے بغیر اُن کے سامنے پیش ہوں گی۔ ویسے حاجی صاحب نے اپنی خدمت کے لئے دو ملازمائیں رکھ لی ہیں۔ خط کے آخر میں لکھا تھا آج کل حاجی صاحب لاحول کے بجائے سبحان اللہ کا وِرد کرتے رہتے ہیں۔"

قربانی کے مہمان

یہ ایک بقر عید کا واقعہ ہے۔

اس بقر عید سے ایک روز پہلے شام کو ہم لوگ بھائی اصغر مہدی صاحب کے گھر مدعو تھے۔ عذرا بھابی نے نہایت مزیدار چیزیں پکا رکھی تھیں، خوب جی بھر کر کھانا کھایا، رخصت ہونے لگے تو ہم نے ویسے ہی پوچھ لیا: "کیوں صاحب! آپ لوگ کل قربانی کر رہے ہیں؟" مہدی بھائی نے جواب دیا۔ "کیا عرض کروں! مجھے بازار جانے تک کی فرصت نصیب نہ ہو سکی؛ لہٰذا ہم لوگ یہ فریضہ ادا نہ کر سکیں گے یا اگر کیا بھی تو بقر عید سے ایک دو روز بعد" — اب ہمارے خیال کے مطابق بھائی اصغر مہدی کو بھی ہم سے پوچھنا چاہیئے تھا کہ ہم کوئی قربانی کر رہے ہیں یا نہیں۔ لیکن غالباً انہوں نے یہ پوچھنا خلافِ تہذیب سمجھا۔ ادھر ہم نے یہ سوچتے ہوئے کہ ایک تو یہ لوگ بقر عید کے دن قربانی نہیں کر رہے ہیں دوسرے ابھی ابھی ہمارے پڑوس میں آئے ہیں کیوں نہ ان کی دعوت عید کے روز دوپہر ہی کو کر دی جائے؛ چنانچہ عرض کیا:

"آپ لوگ کل دوپہر ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔"

"دونوں میاں بیوی ایک زبان ہو کر بولے۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟"

ہم نے اپنی بیگم کی طرف دیکھے بغیر دوبارہ کہا: "بھائی کل تو ویسے بھی عید ہے۔ ملنے تو آپ آئیں گے ہی۔ ذرا تھوڑی دیر اور بیٹھ جایئے گا۔" وہ لوگ خاموش ہو گئے، لیکن جب ہم گھر واپس آنے لگے تو بیگم نے کہا: "آپ بھی عجیب آدمی ہیں کل ان لوگوں کو مدعو کر لیا، مگر یہ نہیں سوچا کھلائیں گے کیا؟ اپنے گھر قربانی نہیں ہو رہی ہے اور بقر عید کو بازار سے گوشت نہیں ملا کرتا۔ کسی کو مدعو

کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا کریں اور اگر پوچھتے ہوئے شرم آتی ہے تو دماغ سے کچھ کام لینے یعنی سوچنے میں کیا حرج ہے۔"

ہم نے بڑے اعتماد سے کہا، "خوب سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے؟"

"ذہن پر ذرا زور ڈال کر بتاؤ کہ ہم نے کیا سوچا ہوگا۔"

"مجھ سے پہیلیاں نہ بجھوایئے، صاف طور سے بات کیجیے، کیونکہ اب ذمّہ داری مجھ پر آن پڑی ہے۔ آپ تو محض زبان ہلا کر ایک طرف ہو گئے۔"

ہم نے ذرا غصّے میں آ کر کہا: "اللہ نے تمہیں آنکھیں بھی دے رکھی ہیں اور کان بھی، لیکن تم ہو کہ قدرت کی ان نعمتوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھاتیں۔"

"معاف کیجیے میں اب بھی نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں پوچھتا ہوں ہمارے برابر کس کا مکان ہے؟"

"بھائی نیاز حیدر صاحب اور آپا قیصر کا ہے۔"

"کیا اس مکان سے تمہیں پورے ایک ہفتے سے "مَیں مَیں" کی آوازیں نہیں آ رہی ہیں؟"

"آپ کا اس سے مطلب؟"

"مطلب پھر بتاؤں گا پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"وہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک نہیں دو دو بکروں نے چلا چلا کر پورا محلہ سر پر اُٹھا رکھا ہے۔"

"یہ بھی تم غلط کہہ رہی ہو دو بکرے ہی نہیں ایک بھیڑ کا جوان بچّہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھائی نیاز حیدر صاحب کے یہ جانور ہی نہیں چلا رہے ہیں، ان کے برابر والے مکان سے بھائی راحت حسین صاحب کا ماشاء اللہ ایک عدد بلند قامت بکرا بھی اپنی گھمبیر آواز سے اپنے وجود کا اعلان کر رہا ہے۔"

"یوں تو سامنے کے گھر سے بھائی انعام کی بکری نے بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔"

"یہ بات ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ پھوپھا نقی ایک عدد جانور خریدنے کے لئے بکر منڈی

گئے ہوئے ہیں۔"

"پھر تو قبلہ حاجی صاحب کے پورے تین عدد دُنبوں کو کیوں فراموش کئے جا رہے ہو۔ جنھوں نے کل ہی قبلہ حاجی صاحب کے سَر میں ٹکر مار کر موصوف کو لہولہان کر ڈالا تھا۔"

"لگے ہاتھ بٹالے والے شاہ صاحب کی بچھیا کی طرف بھی تمہاری توجہ دلاتا چلوں۔"

"مگر اس طرح دوسروں کے گھروں کے جانوروں کو گنوانے سے تمہارا مطلب کیا ہے۔"

بیوی تیوری چڑھا کر بولی۔

ہم نے عرض کیا "مطلب بالکل واضح ہے کہ ان سب کے گھروں سے قربانی کا گوشت آئے گا۔ اگر یہ لوگ پاؤ پاؤ بھر گوشت بھی بھیجیں تو حساب لگاؤ گھر میں کس قدر گوشت جمع ہو جاتا ہے اور یہ میں نے صرف اپنے محلّے کی بات کی ہے۔ شہر سے دوست احباب مثلاً ڈاکٹر اسرار، ڈاکٹر اعجاز حسن، الطاف حسن اور ظفر اللہ گوشت بھیجیں گے یہ اس کے علاوہ ہے۔"

"سوچ لیجیے۔ میرے خیال میں اس کی توقع رکھنا کچھ مناسب نہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں اس طرح کی توقع رکھنا مناسب ہی نہیں، بلکہ ہمارے مسلمان ہونے کی روشن دلیل بھی ہے۔"

"بہر حال میں اب بھی کہتی ہوں کہ آپ اور کچھ نہیں تو ایک عدد مُرغا ہی لے آئیے۔ ممکن ہے کل صبح یہ بھی نہ مل سکے۔" بیوی اپنی بات کہے بغیر نہ رہی اور ہم بھی اپنی بات پر ڈٹ گئے۔ رات کو نہایت آرام سے سوئے اور صبح ہوئی تو حسبِ معمول پہلے غسل کیا اور پھر کپڑے تبدیل کر کے نمازِ عید پڑھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ عید گاہ میں بھائی اصغر مہدی ملے تو ان سے پھر اصرار کر کے کہا کہ دیکھئے آج دوپہر کو ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمانا نہ بھولئے گا۔" وہ بولے۔ "بھائی صاحب بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے آج اپنے اور سب پروگرام ملتوی کر دیئے ہیں۔ کئی دوستوں کے فون آئے سب سے معذرت طلب کر لی۔ آپ کی بھابی کہتی تھیں مشکور بھائی نے اتنے خلوص کے ساتھ دعوت پر بلایا ہے۔ اب کسی دوسرے پروگرام کے بارے میں سوچنا یا ذکر کرنا بھی گناہ ہے۔"

ہم نے بات بنانے کے لئے کہا: "بھابی آپ سے زیادہ عقلمند معلوم ہوتی ہیں۔" اس پر وہ

خوش ہوکر کہنے لگے "ممکن ہے آپ اسے مذاق سمجھیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیوی نے بچّوں کو اچھی طرح ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا۔ کہتی تھیں "بچّو! انکل مشکور اور آنٹی سعیدہ نے آج تمہارے لئے بہت مزے مزے کی چیزیں تیار کی ہیں۔ دوپہر کو ان کی دعوت میں خوب سیر ہوکر کھانا، اب ناشتہ میں کم کھاؤ۔"

بھائی مہدی کے اس خلوص پر نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں کے سامنے یکایک اندھیرا سا آگیا۔ ہم چکرا کر گرنے والے تھے کہ ان سے عید ملنے کا بہانہ بنا کر دوبارہ بغل گیر ہوگئے۔ بظاہر ہمیں اپنی اس حرکت کی یہی وجہ معلوم ہوئی کہ ہم بھائی مہدی صاحب کے خلوص سے مرعُوب ہوگئے ہیں، یقین کیجیئے ہم پر جتنا رُعب خلوص کا پڑتا ہے، کسی چیز کا نہیں پڑتا۔ اسی طرح ہم بھی کسی پر اگر اپنا کوئی رُعب ڈال سکتے ہیں تو وہ بھی خلوص ہی کا رُعب ہوسکتا ہے، لیکن اس وقت ہمیں اپنے خلوص میں کچھ خلا سا نظر آرہا تھا۔

غرض دوستوں سے ملتے ملاتے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے گھر کے عقب میں رہنے والے شیخ صاحب لپکے چلے جارہے ہیں۔ ہم نے انہیں پکار کر کہا: "شیخ صاحب خیریت تو ہے؟ بڑی تیزی سے چلے جارہے ہیں؟"

"مشکور صاحب! قصائی نے کہا تھا نماز پڑھنے کے فوراً بعد گھر آجانا۔"

ہم نے خواہ مخواہ سوال کیا۔ "اگر آپ ذرا دیر سے پہنچے تو پھر کیا ہوگا؟"

"کہتا تھا پھر میں جلدی نہ آسکوں گا۔ کئی گھروں میں قربانی کے لئے جانا ہے۔"

ہم نے سوچا ہر چند ہمارے شیخ صاحب سے ایسے کوئی گہرے مراسم نہیں، لیکن اتنے ضرور ہیں کہ وہ قربانی کا گوشت تقسیم کرتے وقت ہمیں نہ بھولیں گے۔ دل کو اطمینان ہوا کہ لیجیئے اور کہیں سے نہ سہی شیخ صاحب کے گھر سے تو گوشت آیا کہ آیا۔ ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے محلّے کے ایک اور صاحب لپکے جارہے ہیں۔ ان سے تیز رفتاری کی وجہ پُوچھی تو انہوں نے بھی یہی بتایا کہ قصائی نے تاکید کے ساتھ کہا تھا کہ وہ نماز کے بعد سیدھا ان کے گھر آئے گا۔ ابھی چند قدم اور چلے تھے کہ ہم نے دیکھا ہمارے محلے کے ایک اور بزرگ تیزی کے ساتھ چلے جارہے ہیں۔ ان سے عجلت کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ قصائی سب سے پہلے ان کے گھر پہنچ رہا ہے۔ ہم نے

اندازہ لگایا کہ اور کچھ ہو نہ ہو یہ بات بالکل یقینی ہے کہ تمام شہر میں سب سے پہلے ہمارے محلے میں قربانی ہو رہی ہے۔ دِل کو ایک عجیب طرح کی مسّرت کا احساس ہوا اور یوں نہایت اعتماد کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے دس بجے کے قریب اپنے گھر پہنچے۔ بیوی کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ محترمہ عید کی خوشی میں خوش ہونے کے بجائے ناراض بیٹھی ہیں۔ ناراضی کی وجہ پُوچھی تو مزید ناراض ہو کر بولیں۔

"مہمان آنے والے ہیں اور پکانے کے لئے گھر میں کچھ موجود نہیں۔"

"کچھ سے تمہاری مراد گوشت ہے نا۔"

"جی ہاں۔"

"تو پھر تھوڑی دیر ہی میں دیکھو گی کہ گوشت خود بخود ہمارے گھر کی طرف چلا آرہا ہے۔"

"کہاں سے چلا آئے گا؟"

"چاروں طرف سے۔"

"بس رہنے بھی دیجیے اس قسم کی فضول باتوں کو۔"

"کیا بقرعید کے دن گوشت آنے کی توقع رکھنا فضول بات ہے جبکہ محلے میں چاروں طرف بکروں، بھیڑوں، دُنبوں اور گائے بھینسوں نے شور برپا کر رکھا ہو؟"

"میں پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر مِل جائے تو بازار سے جا کر مُرغ لے آیئے۔"

ہم نے سوچا گھر میں بیٹھ کر بیوی سے لڑنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ محلے داروں کے گھروں میں جا کر معلوم کیا جائے کہ قربانی میں کتنی دیر ہے اور اگر ان کی توجہ اس طرف نہیں ہے تو انہیں قربانی کے لئے اکسایا جائے۔ اس کے علاوہ محلے میں کوئی غیر تو نہیں رہتے کہ ان کے ہاں جاتے ہوئے شرم آئے گی، اکثر اپنے عزیز ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ہم اپنے گھر سے نکلے اور سب سے پہلے برابر والے مکان میں پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی بچوں نے یوں شور مچانا شروع کر دیا۔ "آہا جی مشکور چاچا آئے ہیں۔ ہمارے لئے عیدی لائے ہیں۔" ہمیں ایکدم اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ آخر عیدی تو ویسے بھی دینا تھی، ذرا پہلے دینے میں کیا مضائقہ ہے، چنانچہ سب سے بڑے لڑکے کو دس روپے کا نوٹ یہ کہہ کر دیا کہ برخوردار آپس میں تقسیم کر لینا۔ عیدی لے کر بچے ایک طرف ہو گئے۔ شور کم ہوا تو ہم نے محسوس کیا کہ قربانی کے جانوروں میں سے کسی کی آواز نہیں آرہی ہے۔ سوچا غالباً بیچارے ذبح

ہو چکے ہوں گے۔ ایک لمحے کے لئے ان سے ہمدردی پیدا ہوئی لیکن فوراً ہی یہ خیال بھی آیا کہ چلو ہمارے مہمانوں کی ضیافت کے لئے گوشت تو مہیا ہوا، بیوی بلاوجہ ہم سے لڑائی مول لینے کو تیار ہو رہی تھی۔ جیسے ہی صاحبِ خانہ ہمارے پاس آئے ہم نے انہیں داد دینے کے انداز میں کہا:

"بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ سب سے پہلے قربانی کر ڈالی۔"

"کونسی قربانی؟"

"یہی آج کے دن کی۔"

ایکدم ناراض ہو کر بولے: "قربانی کس کی کرتے؟ میں بچوں کے ساتھ نماز پڑھنے عید گاہ گیا ہوا تھا بعد میں ملازم نالائق نے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے کھولا تو وہ ایکدم بھاگ پڑے۔ اسی وقت قصائی آگیا۔ جب قصائی نے دیکھا کہ کوئی بڑا آدمی گھر میں موجود نہیں اور جانور بھی اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں تو یہ کہہ کر چلا گیا کہ جانوروں کو پکڑ کر رکھو میں ایک اور جگہ قربانی کر کے ابھی آتا ہوں۔ وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا آپ جانتے ہیں آج کے دن قصائی جلدی سے کہاں ہاتھ لگتا ہے ـــ اب یہی سمجھو کہ دوپہر کے بعد قربانی ہو سکے گی۔" یہ سنتے ہی ہم ایکدم چلنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صاحبِ خانہ نے قدرے ہنستے ہوئے کہا: "بھائی صاحب! تشریف رکھئے، چائے آرہی ہے۔ آپ تو اس طرح چل پڑے گویا یہی معلوم کرنے آئے تھے۔"

ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا:

"نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے گھر پر ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

بھائی نیاز حیدر صاحب کے گھر سے چل کر ہم قبلہ راحت حسن صاحب کے گھر پہنچے۔ دعا سلام کے بعد بیٹھنے کے بجائے ہم نے سوچا کیوں نہ براہِ راست قربانی کی بات کی جائے اور بات شروع کرنے کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم قربانی کے جانور کے پاس جا کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیریں اور چند الفاظ اس کی تعریف میں کہیں، چنانچہ ہم بکرے کی طرف روانہ ہوئے جو ماشاءاللہ قدو قامت میں بھینسے سے کسی طرح کم نہ تھا جیسے ہی ہم اس کے قریب آئے اس نے ہلکی سی میں میں کی جسے ہم نے سمجھا بکرا کسی اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا ہے اور استقبال کے طور پر ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے، چنانچہ ہم نے نہایت خلوص کے ساتھ اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنا چاہا، مگر ابھی ہمارا ہاتھ اس کی کمر تک نہ پہنچا تھا

کہ اس نے اپنی میں میں کو بُو بُو میں تبدیل کر کے اپنے دو عدد تیز اور نوکیلے سینگوں سے ہماری قمیص پھاڑ ڈالی۔ اتنے میں بیگم حسن صاحبہ نے ہمیں دیکھ لیا۔ فرمانے لگیں: "ارے بھائی! تم اس کٹ کھنے کے پاس کہاں آگئے۔ یہ تو بڑا خونخوار ہے۔" ہم نے سوچا اس وقت مناسب موقع ہے فوراً کہہ دیا جائے کہ ایسے خونخوار جانور کو جس قدر جلدی ہو سکے ذبح کر لینا چاہیئے، لیکن پھر خیال آیا بکرے سے انتقامی رویہ اختیار کرنا ایک انسان کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ ہم خاموشی کے ساتھ اپنی پھٹی ہوئی قمیص لے کر صاحبِ خانہ کے پاس آ بیٹھے۔ صاحبِ خانہ عالم فاضل آدمی تھے۔ سوچا ان سے قربانی کے فلسفے پر بات کرنی چاہیئے۔ اس طرح بحث چلتے چلاتے قربانی کے جانور کی طرف آ جائے گی اور ہم اس ناہنجار بکرے کو فی الفور ذبح کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے؛ چنانچہ ہم نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا: "کیوں جناب! حضرت اسماعیلؑ کی جگہ خدا نے قربانی کے لئے جو دُنبہ ارسال فرمایا تھا وہ ....." ابھی ہم وہ کے بعد جملہ بنانے کی فکر ہی میں تھے کہ باہر کسی نے گھنٹی بجائی۔ دروازے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ہمارے اور صاحبِ خانہ کے ایک مشترکہ عزیز کھڑے ہیں۔ موصوف کو اندر آنے کے لئے کہا گیا۔ یہ صاحب کچھ زیادہ ہی باتونی واقع ہوئے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ انہوں نے اگر کوئی اور بات شروع کر دی تو قربانی درمیان ہی میں رہ جائے گی؛ لہٰذا کیوں نہ ان کی توجہ اصل موضوع کی طرف ہی مبذول کرائی جائے؛ چنانچہ عرض کیا: بھائی صاحب! آپ کے آنے سے پہلے میں قربانی کی بات کر رہا تھا۔" وہ صاحب ایکدم چونک کر صاحبِ خانہ سے مخاطب ہوئے: "کیوں قبلہ! جیسا یہ جانور قربانی کا میں لے کر آیا ہوں آپ نے کبھی ایسا جانور دیکھا ہے۔ واللہ، اس کا گوشت کھائیں گے تو آپ کا ایمان تازہ ہو جائے گا۔ یہ عام ریوڑ کا جانور نہیں ہے۔ میں نے اسے کسی بیوپاری سے بھی نہیں خریدا۔ میرے خالو جان نے اس کی پرورش اپنے دستِ شفقت سے خود فرمائی ہے۔ موصوف کو اس سے اس قدر پیار تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہی کھانا کھلایا کرتے تھے۔ پانی تو اکثر ایک برتن ہی میں دونوں پیتے۔ ایک دفعہ یہ جانور عزیز نصیبِ دشمناں بیمار پڑ گیا۔ خالو جان نے اس وقت تک کھانا نہیں کھایا جب تک وہ تندرست نہ ہو گیا۔ غالباً گھر میں کسی نے ازراہِ مذاق کہہ دیا قبلہ اگر اس جانور کی زندگی منظور ہے تو اسے ہزار مرتبہ اپنی ڈاڑھی کی ہوا دیجیئے۔ یہ الفاظ سننا تھے کہ خالو جان نے ڈاڑھی سے ہوا دینی شروع کر دی

اور ایک ہزار ایک پر جا کر دم لیا۔"

"پھر تو اس جانور کی جلد از جلد قربانی کر دینی چاہیئے۔" ہم نے بزعم خود موقع غنیمت جان کر مشورہ دیا۔

"واہ صاحب واہ! جلد از جلد قربانی کیوں کر دینی چاہیئے۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ایسے جانور کی زیارت جتنی دیر بھی ہوتی رہے غنیمت ہے۔" اُنہوں نے کہا، لیکن صاحبِ خانہ چونکہ اچھے خاصے صاحبِ ذوق واقع ہوئے تھے کہنے لگے: "بھئی قربانی والی بات تو کچھ سمجھ میں آتی ہے، لیکن زیارت کرنا، بلکہ کرتے رہنا اور وہ بھی ایک عدد بکرے کی، کچھ بے تکا سا نظر آتا ہے۔ بکرا نہ ہوا معاذ اللہ کوئی ولی اور مرشد ہو گیا۔

"قبلہ اسے مبالغہ نہ سمجھیئے بہت سے بکرے بھی بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"اماں یار! اس سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔" صاحبِ خانہ بولے۔

ہمیں اپنے مہمان اور ضیافت یاد آ رہی تھی فوراً لقمہ دیا: "فرض کیجیئے قبلہ! یہ بکرا ان صاحب کے بقول پہنچا ہوا ہے، تب بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جلد از جلد قربانی کر دی جائے۔ صاحبِ معرفت بکرے کا گوشت کھائیں گے تو لوگوں میں بھی کچھ عرفان اور شعور پیدا ہو گا۔"

صاحبِ خانہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"میاں آپ نے بات مزیدار کی ہے لیکن ....."

"لیکن کیا؟" ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"لیکن یہی کہ ہمیں فی الحال اس بکرے کی زیارت ہی کرنا پڑے گی۔"

"واقعی جناب نے درست فرمایا ہے۔ قصائی کے آنے تک تو زیارت ہی کرنا ہو گی۔"

"قصائی تو آیا تھا۔"

"جی پھر کیا ہوا؟" ہم نے یہ سوال کچھ اتنی واضح گھبراہٹ کے ساتھ کیا کہ صاحبِ خانہ کہنے لگے:

"مشکور میاں! ایسا معلوم ہوتا ہے آپ تو اس غریب بکرے کو ایک لمحہ کے لئے بھی

زندہ نہیں دیکھنا چاہتے؟"

"نہیں جناب! میں تو یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ سُنا ہے قربانی کے جانور کو زیادہ دیر تک گھر میں نہیں رکھنا چاہیئے"۔

"میں بھی اسی خیال کا آدمی ہوں، لیکن ......"

"آپ نے پھر 'لیکن' کہہ دیا"۔

"بھئی میری بات تو پوری طرح سُن لیجئے"۔ ہمیں پھر اپنی بیوی، ضیافت اور مہمان یاد آئے اور ہمارے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔

"میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔ غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بکرے کے مہمانوں کی ضیافت ہے"۔

صاحبِ خانہ ایکدم جھنجلا کر بولے۔ "میاں یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ بکرے کے مہمانوں کی ضیافت، بھلا سوچ کر بتاؤ اس جملے کے کیا معنی بنتے ہیں"۔ صاحبِ خانہ کے اس سوال پر ہم مزید بوکھلا گئے اور بکرے کی شان میں غالب کا یہ دعائیہ شعر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ پڑھ کر کھڑے ہو گئے ؎

یہ سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ہم جانے لگے تو صاحبِ خانہ نے ہمیں روک کر کہا:

"برخوردار! معلوم نہیں یکایک یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ بہر حال تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر وہ آج آگیا تو آج ہی اس بکرے کو ذبح کر دیا جائے گا ورنہ ہم کل قربانی کریں گے"۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس جواب پر ہم خاموشی سے گھر چلے جاتے لیکن چلتے ہوئے ہماری زبان سے بے اختیار نکل گیا "قربانی تو عید کے دن ہونی چاہیئے، باقی سب فضول باتیں ہیں"۔ حسن صاحب ناراض ہو کر کہنے لگے:

"خدا کی شان ہے یہ کل کا چھوکرا ابھی ہمیں قربانی کے آداب سکھا رہا ہے"۔

جوں توں کر کے ہم کاشانۂ حسن سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شیخ صاحب کے گھر سے قصائی برآمد ہو رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں بکرے کا کٹا ہوا سر

تھا۔ ہماری باچھیں بے ساختہ کھل گئیں۔ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ محلے کے ایک گھر میں تو قربانی ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی عین سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر دو رکعت نماز شکر ادا کی جائے، مگر کچھ سوچ کر خاموش ہونا پڑا۔ قصائی قریب آیا تو ہم نے اس سے ہمکلام ہونے کی غرض سے پوچھا: "کیوں بھئی شیخ صاحب کے گھر قربانی کرآئے"۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں، شیخ ہیں یا چودھری یا ملک، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہیں بہت کنجوس"۔

"کیوں کیا بات ہوئی؟"

"بس جی کچھ پوچھو مت۔ پاؤ بھر گوشت دیتے ہوئے بھی ان کی جان نکل رہی تھی، مگر کوئی بات نہیں میں بھی پوری ہری چرا کر لایا ہوں"۔

"چوری کی بات تم ہمیں بتا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ ہم شیخ صاحب کے محلے دار ہیں"۔

"پھر کیا ہوا میں نہ شیخ صاحب سے ڈرتا ہوں اور نہ آپ سے"۔ یہ کہہ کر قصائی نے چھری کی طرف جو دیکھا تو ہمارے تمام جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہم نے قصائی کی جانب کچھ اس انداز سے نگاہ ڈالی جیسے بتا رہے ہوں کہ پیارے ہم سے ناراض نہ ہو ہم تو تمہارے خادم ہیں۔ ہمارے اِس احساس کو بھانپتے ہوئے قصائی بولا "کیوں بابو جی کیا آپ کو بھی قربانی کرانی ہے"؟

"کرانی تھی"۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اب کیوں نہیں کرا لیتے میں دو منٹ میں بکرا ذبح کر دوں گا اور اس کی کھال کھینچ کر گوشت بھی بنا دوں گا"۔

"واقعی تم بہت ماہر قصائی معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری پھرتی کی داد دیتا ہوں"۔

"بابو جی آپ سب باتیں چھوڑیں اور جلدی سے بکرا گھر میں سے نکال کر لائیں"۔

"قصائی صاحب! عرض یہ ہے کہ ہم قربانی کرا چکے ہیں"۔

"کس سے؟"

"ایک دوسرے قصائی سے۔"

"یہ میرا حلقہ ہے کسی دوسرے قصائی کی مجال نہیں جو یہاں قدم رکھ سکے۔ مجھے اس قصائی کا نام بتایئے۔"

ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہمارے تو قربانی ہونا ہی نہیں تھی، ہم نے تو ویسے ہی قربانی کا ذکر کر ڈالا تھا۔ آخر غصے کے مارے قصائی کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تو ہم نے اسے اصل واقعہ بتایا، مگر اس پر بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے ہماری باتوں پر پوری طرح یقین نہیں آیا۔ قصائی کو اپنے برابر والے گھر میں داخل کر کے ہم نے سوچا کیوں نہ شیخ صاحب کے ہاں ایک چکر لگا لیا جائے۔ اگر وہ بھول بھی گئے ہوں گے تو ہمیں دیکھ کر انہیں یاد آجائے گا کہ قربانی کا گوشت ہمارے گھر بھی بھیجنا ہے۔ ہم شیخ صاحب کے گھر کے سامنے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں دو چار مانگنے والے کھڑے ہیں۔ یقین کیجیے، ہمیں اس وقت یوں لگا جیسے ہم نہیں آئے بلکہ ان میں ایک مانگنے والے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور اُلٹے پاؤں ہو لیے، مگر ہم اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اس جذبۂ غیرت سے ہمیں کوئی خاص دلی سکون حاصل نہیں ہوا۔ بس یوں لگا جیسے ہم خواہ مخواہ جذبات میں آگئے ہیں۔ شیخ صاحب ہمارے محلے میں رہتے ہیں اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم خدانخواستہ بھکاری نہیں ہیں۔ یوں بھی شیخ صاحب کا ہمارے ہاں گوشت بھیجنا ایک اخلاقی اور دینی فریضہ ہے۔ اگر وہ اسے بھول رہے ہیں تو ہمارا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ ہم انہیں اس فریضے کی ادائیگی کی یاد دلائیں، چنانچہ اس خیال کے آتے ہی ہم دوبارہ شیخ صاحب کے گھر کی طرف ہو لیے۔ دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر ایک طرح کی مسرت ہوئی کہ اب وہاں کوئی مانگنے والا موجود نہ تھا۔ ہم نے بڑے اعتماد کے ساتھ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ہمارا بٹن دبانا تھا کہ اندر سے شیخ صاحب کی آواز آئی۔

"کون ہے بے اُلو کے پٹھے!"

یہ سوچ کر کہ شیخ صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے ہم نے نہایت وثوق سے دونوں لفظوں پر زور دے کر کہا: "میں ہوں۔"

"میں ہوں کے بچے! کہہ تو دیا کہ قربانی کا گوشت ختم ہو چکا ہے"۔

اب ہمیں پورا یقین ہو گیا کہ شیخ صاحب نے ہمیں پہچانا نہیں، لہٰذا آواز کا جواب آواز سے دینے کے بجائے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دوبارہ بٹن دبایا جائے اس طرح شیخ صاحب کو صاف پتہ چل جائے گا کہ کوئی گوشت مانگنے والا نہیں، بلکہ ہم ہیں۔ شیخ صاحب کے معزز محلے دار۔۔۔ اِدھر ہماری انگلی نے بٹن پر پہنچ کر ذرا سی حرکت دی اُدھر شیخ صاحب پھر چلائے:

"حرام خور کہیں کے! باز نہیں آئے گا؟ باہر آ کر تیری گردن اڑا ڈالوں گا۔ قصائی ہمارے بکرے کی سری چُرا کر لے گیا ہے۔ اس کے بجائے ہم تیری سری بھون کر کھائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنے مہمانوں کے لئے اس وقت ہر قیمت پر گوشت درکار تھا، لیکن شیخ صاحب کے اس اعلان کے بعد وہاں ٹھہرنا ہمارے لئے کوئی آسان نہ تھا چنانچہ فوراً چل پڑے۔ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعجاز حسن کے بھانجے مسٹر اخلاق ہمارے گھر کی طرف سے سائیکل ہاتھ میں لئے آ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہماری تمام کوفت دُور ہو گئی۔ بے اختیار دل نے چاہا کہ سجدۂ شکر ادا کیا جائے، لیکن عقل نے فوراً سمجھایا کہ اے دلِ مشکور! تیرا گھر دُور نہیں وہاں جا کر باقاعدہ طور پر یہ فرض ادا کرنا۔ عزیزم اخلاق سے لپک کر عید ملے اور فرطِ مسرت میں آ کر اس غریب کو اس قدر زور سے بھینچا کہ اسے کہنا پڑا "بھائی مشکور! خیریت تو ہے آج، بلکہ اس وقت آپ میں کچھ زیادہ ہی طاقت آ گئی ہے۔ مجھے پہلے بھی ایک دو بار آپ سے بغلگیر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، لیکن اتنے زور سے آپ کبھی گلے نہیں ملے"۔ ہم نے اخلاق کی کوئی بات نہیں سُنی۔ پاس ہی کوکا کولا کی دکان تھی چشم زدن میں بوتل کھلوائی اور اس کی خدمت میں پیش کر دی۔۔۔ اخلاق کہہ رہا تھا:

"بھائی مشکور صاحب! مجھے پھر کہنا پڑ رہا ہے آج آپ کچھ زیادہ ہی مسرور نظر آ رہے ہیں"۔

"ایسی کوئی بات نہیں"۔ ہم نے عرض کیا۔

"بات تو ضرور ہے"۔

"نہیں میاں! آپ یہ سنائیں ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے"؟

"بالکل خیریت سے ہیں۔ آپ کو یاد کر رہے تھے"۔

"چلیے انہوں نے تو یاد کرنے کا کوئی ثبوت بھی دے دیا۔ میں تو اتنا بھی نہ کر سکا کہ آج ان سے عید ہی مل آتا"۔

"مگر وہ تو۔ ۔ ۔"۔ اخلاق کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ہم نے کوئی دوسرا ذکر شروع کر دیا۔ آخر چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب سمجھ رہے تھے کہ آپ آج لاہور میں نہیں ہوں گے۔ اسی لئے"۔

"او ہو بھئی اب مزید تشریح کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر دینا"۔

"کس بات کا شکریہ"؟

"یہی کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا"۔

اخلاق سے رخصت ہو کر ہم سیدھے گھر پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی بیگم آگ بگولہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں:

"آپ اب تک کہاں تھے"؟

"ہم کہیں بھی ہوں، آپ کا مسئلہ تو حل ہو گیا"۔

"کون سا مسئلہ"؟

"ارے بھئی گوشت کا مسئلہ۔ اب یہ بتاؤ پکاؤ گی کیا کچھ"؟

"میں پوچھتی ہوں آپ کا دماغ چل گیا ہے"؟

"اچھا میری جان اگر زیادہ چیزیں پکانے کا وقت نہیں رہا تو صرف پلاؤ ہی پکا لیجیے"۔

"مگر میں پوچھتی ہوں پلاؤ کس چیز کی پکا لوں"؟

"گوشت اور چاولوں کی"۔

"کیا خیال ہے اپنے گوشت کی پلاؤ پکا لوں"۔

"ڈاکٹر اعجاز کے یہاں سے گوشت نہیں آیا"؟

"کون لایا — آپ خود گئے تھے"۔

"کیا ابھی ابھی اخلاق گوشت نہیں دے کر گیا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک بجنے کو آ رہا ہے۔ مہمان آنے والے ہیں مگر آپ ابھی تک اسی خیال میں ہیں کہ کوئی گوشت بھیجے گا تو ضیافت کھلائیں گے۔"

"پھر آپ نے بھی کوئی انتظام کیا ہے۔"

"میں کیا کر سکتی تھی گھر میں مونگ کی دال پڑی تھی وہ پکا کر رکھ لی ہے۔"

"گویا مہمانوں کو آپ مونگ کی دال کھلائیں گی۔"

"آپ انہیں پلاؤ، زردہ، متنجن کھلا لیجئے — میں کب منع کرتی ہوں۔" بیوی نے جل کر کہا اور ہم بھی پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ سامنے کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی انعام صاحب ٹہل رہے ہیں۔ بھائی انعام ہمارے محلے کی بڑی ہر دلعزیز شخصیت ہیں اور بھائی انعام ہی پر کیا ان کی بیگم بھی اسی طرح ہر دلعزیز ہیں۔ ہر شخص کی خوشی میں شامل ہونے والی اور ہر ایک کے غم میں شریک۔ غرض دونوں میاں بیوی بے حد شریف واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا اور کہیں سے گوشت آئے یا نہ آئے لیکن بھائی انعام ہمیں یاد رکھنا کسی صورت میں بھی نہیں بھول سکتے۔ ہم نے بڑے یقین کے ساتھ پوچھا: "بھائی صاحب! آپ اس آسودگی کے ساتھ محوِ خرام ہیں جیسے قربانی کے فریضے سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔"

قربانی کے فریضے سے عہدہ برآ تو نہیں ہوا! البتہ اس سے فراغت ضرور حاصل کر لی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ قربانی ہو چکی ہے لیکن گوشت تقسیم کرنا باقی ہے — لایئے اس کارِ خیر میں آپ کا ہاتھ میں بٹائے دیتا ہوں۔"

"مگر....."

"مگر وگر کے تکلف کو چھوڑیئے اور گوشت لایئے۔"

"لیکن....."

"پھر وہی لیکن۔ بھائی صاحب مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی ملازمہ بیمار ہے گھر پر کوئی دوسرا آدمی بھی نہیں ہے۔ پھر اگر گوشت تقسیم کرنے میں آپ کے ساتھ میں تھوڑی سی مدد کر دوں گا تو اس سے میرا کیا گھس جائے گا۔"

"اوہو بھائی مشکور . . . ." انعام صاحب پھر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ہم درمیان میں پھر بول پڑے۔

"آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ اچھا چلئے دوسرے لوگوں کے گھروں میں گوشت آپ خود تقسیم کر آئیں۔ کم از کم میرے حصّے کا گوشت تو مجھے لے جانے دیجیے۔"

"میں کہتا ہوں . . . ."

"آپ کیا کہتے ہیں . . . . . مگر ٹھہریئے آپ کو یہ خیال تو نہیں ہو گیا ہے کہ . . . ."

"مجھے کچھ خیال نہیں ہوا . . . . ."

"تو پھر لائیے میرے حِصّے کا گوشت۔"

"گوشت" بھائی انعام نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی ہاں گوشت۔" انہوں نے گوشت لانے میں لیت و لعل کی تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ حضرت کسی وجہ سے ہمیں گوشت نہیں دینا چاہتے؛ چنانچہ ہم نے ان سے بلاجھجک کہہ ڈالا۔ "دیکھو بھائی انعام صاحب! اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مجھے گوشت کی اس وقت سخت ضرورت ہے تو معاف کیجیے ایسی کوئی بات نہیں۔ اس لاہور شہر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اگر انہوں نے پاؤ پاؤ بھر گوشت بھی بھیجا ہو گا تو اس وقت گھر میں کم از کم ایک من گوشت جمع ہو چکا ہو گا۔ مجھے آپ کی قربانی کے گوشت کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"ارے بھائی مشکور! آپ ناحق مجھ سے ناراض کیوں ہوئے جا رہے ہیں۔"

"میں ناراض قطعی نہیں ہو رہا ہوں صرف اظہارِ حقیقت کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر کچھ مجھے بھی تو اظہارِ حقیقت کی اجازت دیجیے۔"

"ہاں ہاں ضرور — فرمایئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے گھر میں ابھی تک قربانی نہیں ہوئی۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے . . . ."

"مجھے آپ نے کچھ کہنے ہی نہ دیا۔"

"پھر قربانی کب کر رہے ہیں ؟"

"اس دفعہ قربانی ہوتی نظر نہیں آتی"۔

"وہ آپ کی بکری کو کیا ہوا ؟"

"آج صبح اسے ذبح کرنے کے لئے پانی پلایا تو اس کے تھنوں میں دودھ اُتر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی آپ کی بھابی نے شور مچا ڈالا کہ بکری ذبح نہ ہوگی بلکہ اسے پالا جائے گا، چنانچہ اس وقت بکری ہمارے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے صحن میں مَیں مَیں کرتی پھر رہی ہے"۔

"آپ کو اس بکری پر غصہ نہیں آرہا ہے ؟ .... اور ..... اور ..."

"برادرم بیوی کی اتنی فرمانبرداری بھی کوئی اچھی بات نہیں"۔ میں نے یہ فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ بیگم انعام نے بلند آواز سے کہا: "بھائی مشکور! یہ آپ انعام صاحب کو کیا بہکا رہے ہیں ؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کو ہمیشہ بیوی کے تابع فرمان رہنا چاہیئے۔ اس سے گھر میں بڑا امن وسکون قائم رہتا ہے"۔

"مگر مجھے تو کچھ اور ہی سنائی دے رہا تھا"۔

"غلط سُننا مومنوں کی علامت نہیں"۔

اس گفتگو کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ محلے والوں کو قربانی کے لئے اُکسانے کے بجائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر بھروسہ کر کے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ اس طرح ایک تو خواہ مخواہ قسم کھانے کے لئے مہمانوں سے یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ ہم کب سے انتظار میں مصروف ہیں، دوسرے آنے جانے والوں کا پتہ چلتا رہے گا کہ قربانی کا گوشت کس کس کے گھر جا رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ محلے والوں نے ہم سے کوئی چال تو نہیں چلی۔ ہو سکتا ہے ہمیں کہہ رہے ہوں قربانی نہیں کی اور چپکے سے قربانی کر ڈالی ہو۔ ہم ابھی اسی سوچ بچار میں مبتلا تھے کہ ہم نے دیکھا قبلہ شیخ صاحب سینی اُٹھائے، ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ ہمیں اسی وقت یوں محسوس ہوا جیسے شیخ صاحب نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت خوانِ جنت لئے چلا آرہا ہے۔ ہمارے دل میں شیخ صاحب کی طرف

سے جو معمولی سی کدورت پیدا ہوئی تھی وہ بھی یکدم دُور ہو گئی بلکہ ہمیں ندامت محسوس ہوئی اور شیخ صاحب کے لئے دل سے بے ساختہ دعائیں نکلنے لگیں۔ موصوف ابھی ہم سے پانچ چھ گز دُور ہی تھے کہ کہنے لگے "مشکور صاحب آج کل ہر جگہ بے ایمانی چل رہی ہے۔" جی چاہا کہ شیخ صاحب کے اس عام سے فقرے کا کوئی خاص سا جواب دیا جائے، لیکن پھر خیال آیا کہ شیخ صاحب تو اس وقت ہمارے مربی اور مہربان ہیں، ان کی خدمت میں کوئی چبھتی ہوئی بات کہنی نہ صرف بداخلاقی میں شمار ہوگی، بلکہ ہماری غیر مصلحت کوشی اور حماقت بھی کہلائے گی۔ ہم نے جی، ہاں، ہوں میں جواب دے کر بات آئی گئی کرنا چاہی، مگر انہوں نے ایک اور سوال کر ڈالا "آپ نے میرا قربانی کا بکرا دیکھا تھا؟" اگرچہ ہم نے نہیں دیکھا تھا لیکن سر جھکا کر اور دانت نکال کر عرض کیا "جی ہاں دیکھا تھا۔ ماشاءاللہ!"

"ارے بھائی ماشاءاللہ کہہ رہے ہو۔"

"جی اور کیا عرض کروں۔ اناللہ۔"

ہنس کر بولے "اب تو واقعی اناللہ بھی کہہ سکتے ہو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا......"

شیخ صاحب مزید کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر ہم نے سوچا کہ موصوف کو بارِ امانت سے ہلکا کر دیا جائے۔ گوشت سے بھری ہوئی سینی لیتے ہوئے یا یوں کہہ لیجیے کہ چھینتے ہوئے عرض کیا: "قبلہ اتنا زیادہ گوشت لانے کی کیا ضرورت تھی۔" یہ کہہ کر اس سے قبل کہ شیخ صاحب کچھ فرماتے ہم سینی لے کر گھر میں اندر کی طرف چل پڑے۔ شیخ صاحب نے پریشان ہو کر کہا: "مگر مشکور صاحب! یہ آپ......؟"

"جی میں ابھی آکر آپ کی بات سنتا ہوں۔ گوشت اندر رکھ آؤں۔"

"لیکن آپ میری بات تو سنیں۔"

"جی میں سمجھ گیا۔ سینی خالی کر کے ابھی واپس لے آؤں گا۔"

"مگر میری بات تو سُن لیجیے۔"

ہم نے رُک کر کہا: "فرمایئے؟" لیکن اس ایک لفظ کے ساتھ ہماری پیشانی پر انجانے طور پر کئی شکن پڑ گئے۔ جنہیں دیکھ کر شیخ صاحب نے کہا: "مگر مشکور صاحب! آپ ناراض

کیوں ہو رہے ہیں ؟"

"قبلہ میں ناراض نہیں ہو رہا ہوں، بلکہ یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے اتنی زحمت کیوں فرمائی۔ ہمارے لئے تو صرف ایک ران کافی تھی۔"

"ایک ران ؟"

"جی ہاں ایک ران، کیونکہ گھر میں کافی گوشت آ چکا ہے اور ابھی شام تک آتا رہے گا۔" ہم نے بلاوجہ جھوٹ بولا۔ شیخ صاحب نے ہمارے جھوٹ کو سُنا ان سُنا کرتے ہوئے کہا: "مگر بھائی میں یہی تو کہہ رہا ہوں اس کمبخت بکرے کی ران نہیں تھی۔"

"ران نہیں تھی ؟"

"جی ہاں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"کیسے کا مجھے معلوم نہیں، مگر جو ہوا وہ میں نے عرض کر دیا ہے۔"

"چلئے اگر ران نہیں تھی تو ہمارے لئے ایک دستی کافی تھی۔"

"اس بکرے کے دستی بھی نہیں تھی۔"

"ران نہیں تھی، دستی نہیں تھی اور ۔ ۔ ۔ ۔ چانپ ؟"

"چانپ بھی نہیں۔"

ہم نے جل کر کہا۔ "دم اور سینگ تو ہوں گے ؟"

"جی ہاں وہ نہ ہوتے تو اسے بکرا کون کہتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا آپ دم اور سینگ لے کر آئے ہیں۔" اس عرصے میں شیخ صاحب نے سینی ہم سے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ سینی میں سے ایک پڑیا سی نکال کر ہمیں دیتے ہوئے کہا: "دم اور سینگ تو نہیں، البتہ سینے کا کچھ حصہ آپ کے لئے حاضر ہے۔" شیخ صاحب چلے گئے تو ہم نے کاغذ کی پڑیا کھول کر دیکھا تو اس میں سینے کی ڈکری کے بجائے باریک باریک پسلیوں کے تین چار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لپٹے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ خیال کیا کہ خدا کے نام پر آئے ہوئے اس تحفے کو حقیر سمجھنا کفرانِ نعمت ہے۔ کیوں نہ بیوی سے کہا جائے کہ وہ انہیں مسالے

میں بھوننے کا اہتمام کرے انشاء اللہ ابتدا ہو گئی، مزید گوشت بھی آجائے گا۔ ہم نے اس نیک خیال کے ساتھ اندر کمرے میں جانے کے لئے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ ہمیں یوں لگا کوئی چیز نہ صرف گوشت کی اس پڑیا کو، بلکہ ہمارے ہاتھ ہی کو اُڑا کر لے گئی ہے۔ پتہ چلا کہ ایک چیل اس تحفۂ درویش کو تاڑ رہی تھی جیسے ہی اس نے موقع مناسب جانا اس پر حملہ کر دیا، لیکن چونکہ بکرے کی پسلیوں کے ٹکڑے چیل کے پنجے کے لئے ناکافی تھے، اس لئے اس کمی کو پُورا کرنے کی خاطر اسے کچھ گوشت ہماری ہتھیلی کا حاصل کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑی ـــــ ہم اپنا لہولہان ہاتھ لئے کھڑے تھے کہ اندر سے بیگم نکل کر آئیں اور طنزیہ انداز میں مخاطب ہو کر بولیں: "یہ کس کے خون میں ہاتھ رنگ کر کھڑے تھے؟"

"میری جان! ایک غریب آدمی اپنے سوا کس کے خون میں ہاتھ رنگ سکتا ہے"! بیوی کو جب اصل واقعہ معلوم ہوا تو بے چاری گھبرا گئیں اور جلدی سے مرہم پٹی کا انتظام کیا۔

مرہم پٹی ہو گئی تو بیوی کے ماتھے پر پھر بل پڑ گئے۔ کہنے لگیں۔ "کچھ خبر ہے اس وقت کیا بجا ہے؟"

"میں اس وقت اپنے آپ کو زمان و مکان سے بالا تصوّر کر رہا ہوں"۔

"مذاق چھوڑیئے"۔

"فرض کیجئے میں سنجیدہ بھی ہو جاؤں تو کیا کر سکتا ہوں؟"

"کم از کم اپنے کان تو کھینچ سکتے ہیں اور یہ توبہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ اس طرح بے سروسامانی میں کسی کو مدعو نہیں کریں گے"۔

"مجھے اب بھی یقین ہے کہ میرا مولا میری مدد فرمائے گا"۔

"کیا ہو گا؟"

"ہونا کیا تھا گوشت آئے گا اور ہم ٹھاٹھ کے ساتھ مہمانوں کی تواضع کریں گے"۔

"بس رہنے دیجئے مجھے تو آپ کی اس قسم کی باتیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں"۔

"کیا سوچنے پر؟"

"نہ پُوچھیں تو اچھا ہے"۔

"پھر بھی"

"یہی کہ آپ شیخ چلی کے خاندان سے کوئی قریبی تعلق رکھتے ہیں"۔

"میرا خیال ہے لڑنے کے بجائے اگر میں باہر دروازے کے سامنے کھڑا ہوتا تو زیادہ مناسب ہے۔ اللہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا کرے گا"۔

"آپ صرف اللہ پر بھروسہ رکھنے میں مصروف رہیں، لوگ حسبِ توفیق بکرا، دنبہ، گائے، بھینس ذبح کرنے میں مصروف ہیں"۔

"میں کہتا ہوں تم مجھے خواہ مخواہ لڑنے پر اُکسا رہی ہو اور اس وقت میرا لڑنے کا موڈ بالکل نہیں ہے"۔

"بس رہنے دیجئے، آپ تو ہزار بار لڑنے کو تیار ہو جاتے لیکن آپ کے پاس لڑنے کے لئے ہے کیا"۔

"خدانخواستہ میرے ہاتھ پاؤں نہیں ہیں؟ زبان نہیں ہے؟ آخر مجھ میں کس چیز کی کمی ہے"؟

"ہاتھ پاؤں اور زبان سے نہیں لڑا جاتا۔ لڑنے کے لئے آدمی کو حقیقت پسند ہونا پڑتا ہے اور وہ آپ کبھی نہیں ہوئے"۔

ہم نے جب دیکھا کہ لڑائی کے لئے میدان بالکل تیار ہے لیکن ہم ذاتی طور پر تیار نہیں ہیں تو فوراً جواب دیئے بغیر گھر سے باہر نکل آئے۔ ابھی ہمیں اپنے دروازے کے سامنے کھڑے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ بھائی نیاز حیدر کے فرزندِ ارجمند یعنی ہمارے بھتیجے مسٹر وقار آئے اور کہنے لگے: "چچا جان آپ کو ابو بلا رہے ہیں"۔

"کیوں، خیریت ہے"۔

"جی ہاں آپ تشریف لائیے"۔

"پھر بھی کچھ بتایئے تو سہی"۔

"آپ میرے ساتھ تشریف لائیں"۔

"قربانی ہو چکی"؟

"جی ہاں"۔

"مگر کیسے"؟

"اسی قصائی نے کی ہے جسے آپ نے کچھ دیر ہوئی ہمارے گھر بھیجا تھا"۔

ہم نے دل میں سوچا یہ لیجئے اللہ تعالیٰ نے حسن وخوبی سے مسئلہ حل کر دیا۔ بیوی خواہ مخواہ مایوس ہو رہی تھیں۔ بھائی نیاز حیدر صاحب کے گھر پہنچے تو موصوف ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "آؤ بھائی مشکور! گرم گرم سیخ کے کباب تیار ہیں"۔

"مگر.....؟"

"مگر کیا.... ارے بھائی تکلف نہ کریں بڑے مزیدار ہیں"۔

"آپ نے قربانی کا گوشت تقسیم کر دیا۔ ہم نے موقع کے لحاظ سے نہایت نامعقول سوال کر ڈالا جس پر بھائی نیاز حیدر نے کہا: "میاں یہ آپ کی آپا کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو کھانے سے غرض ہے"۔

یہ سن کر آپا قیصر بولیں: "اوّل خویش بعدہ درویش۔ میں نے سوچا یہ بکرا نسبتاً چھوٹا تھا گھر کے بچوں کے لئے رکھ لیا۔ بڑے بکرے کا گوشت تقسیم کر دیں گے"۔

"آپ نے دو بکروں کی قربانی کی ہے"؟

"نہیں دوسرا کل کریں گے"۔

"اس کا مطلب یہ کہ آج آپ گوشت تقسیم نہیں کر رہی ہیں"۔

آپا نے ہنس کر کہا: "ہاں بھائی اس کا مطلب تو یہی ہے، مگر آپ اس مسئلے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ بیگم حسن بھی کہہ رہی تھیں کہ آج صبح صبح مشکور ہمارے گھر آیا تھا اس کی باتوں سے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ چاہتا ہے قربانی جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے"۔

"جی ہاں آپا میں سمجھتا ہوں قربانی کا جانور جلد قربان ہو جانا چاہیئے"۔

"مگر بھائی یہ فلسفہ آپ اسی دفعہ سب کو بتاتے پھر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کی عیدوں میں تو آپ نے کبھی اس طرح قربانی کے لئے زور نہیں دیا"۔

ہم نے خواہ مخواہ جواب بناتے ہوئے کہا: "دراصل آپا! میں دیکھ رہا ہوں کہ من حیث القوم ہم لوگ قربانی کرنے سے کچھ زیادہ ہی گریز کرنے لگے ہیں"۔

"ارے بھائی قوم کی بات چھوڑو ـــ یوں تو پھر ہم صدیوں سے قربانی کو بھولے ہوئے ہیں۔"

"آپ چاہتی ہیں قوم کے بارے میں شکایت ہی نہ کرنی چاہیئے۔"

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں، میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ آپ۔"

"میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ آپ اپنا دوسرا بکرا بھی آج ہی، بلکہ اسی وقت ذبح کرا ڈالیئے۔"

"اے بھائی! صرف میرے بکرے پر ہی کیوں زور دے رہے ہو۔ محلّے میں اور بھی قربانی کے جانور ہیں۔"

"جی فی الحال میری آنکھوں کے سامنے تو آپ ہی کا بکرا موجود ہے۔"

بھائی نیاز حیدر صاحب بولے: "بھائی مشکور آپ کس بحث میں پڑ گئے۔ میاں گرم گرم کباب کھاؤ۔ قربانی کا کیا ہے، آج نہیں تو کل ہو جائے گی۔" ہمیں پھر اپنے مہمان یاد آ گئے۔ ہم نے پھر بے ساختہ کہہ ڈالا۔ "صاحب آپ کل پر ہی کیوں اصرار کر رہے ہیں آج ہی قربانی کیوں نہیں ہونے دیتے۔"

"مجھے فوری قربانی پر کوئی اعتراض نہیں، مگر سوچ لیجیئے قصائی جا چکا ہے۔"

بھائی نیاز حیدر کے اس جملے نے ہم پر پوری طرح واضح کر دیا کہ ان کے گھر سے ہمیں فی الفور کچھ حاصل ہوتا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا کوئی بہانہ بنا کر جلدی سے باہر آ گئے۔ آتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا ٹرے لئے ہمارے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ ہم لپک کر اس کے قریب آئے۔ پوچھا: "بیٹا کیسے آنا ہوا۔"

"چودھری صاحب نے گوشت بھیجا ہے ـــ یہ کہہ کر اس نے ہمیں ایک کاغذ کی پڑیا سی پکڑا دی۔ ہم نے اس پڑیا کو انگلیوں میں لے کر دیکھا تو یوں لگا جیسے گوشت کے بجائے کوئی اور نرم سی چیز ہے۔ کھولا تو پتہ چلا کہ گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی کو چھیچھڑوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ لڑکے کو یہ پڑیا واپس کرتے ہوئے ہم نے کہا: "بیٹا: ایسا معلوم ہوتا ہے تم نے کسی اور کے گھر کا گوشت ہمیں دے دیا ہے۔"

"نہیں جی یہ آپ ہی کے لئے ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اِس لئے کہ سارے حصّے ایک جیسے ہیں۔" ہم نے ٹرے پر سے کپڑا اُٹھا کر دیکھا تو واقعی تمام پڑیوں میں چھیچھڑے پلٹے تھے۔ ہمیں خیال آیا اس پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں آخر چھیچھڑے بھی تو قربانی کے جانور ہی کا ایک حصّہ ہیں۔ ہمارا توکّل ملاحظہ فرمائیے کہ ہم اسی چھیچھڑوں والی پڑیا کو لے کر اندر آ گئے اور بیوی سے کہا فوراً ان چھیچھڑوں کی یخنی تیار کر لیں۔ اس نیک بخت نے جواب دیا "آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ چھیچھڑوں کی یخنی کس کس کی ناک میں دیں گے۔" ہم نے بیوی کو پھر تنبیہہ کی کہ دیکھو اس طرح کفرانِ نعمت نہیں کیا کرتے۔ تم چھیچھڑوں کی یخنی تیار کرو گی تو اللہ تمہیں گوشت بھی دے گا۔"

"صبح سے اب تک تو اللہ میاں نے ایسا کیا نہیں اب کیسے کر دے گا۔"

"اسے فضل کرتے نہیں لگتی دیر۔" ہم نے ابھی یہ مصرعہ پڑھا ہی تھا کہ ایک بچّے نے آ کر خبر دی کہ "مہمان چلے آ رہے ہیں۔" بیوی تو ایکدم "ہائے اللہ!" کہہ کر اندر چلی گئیں اور ہم باہر نکلے لیکن حق بات یہ ہے کہ مہمانوں کی آمد کی خبر سُن کر ایک بار تو ہمارے پاؤں تلے کی زمین بھی سِرک گئی تھی اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بہرحال اپنے آپ کو حتی المقدور سنبھالتے ہوئے آگے بڑھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی اصغر مہدی صاحب کے ایک ہاتھ میں بکرے کی ران ہے۔ ہم نے وہ ران لاشعوری طور پر ان سے چھینتے ہوئے عرض کیا "بھائی صاحب اس تکلّف کی کیا ضرورت تھی۔"

"معاف کیجئے یہ ہم آپ کے لئے نہیں لائے، بلکہ راستے میں ایک دوست کا نوکر لاتے ہوئے مل گیا۔ سوچا واپس جا کر اسے گھر میں رکھنے کے بجائے کیوں نہ ساتھ لیتے چلیں۔ جب گھر جائیں گے اسے بھی لے جائیں گے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم نے ڈرائنگ رُوم کا دروازہ کھولا۔ مہمانوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود وہ ران لے کر بیوی کے پاس پہنچے۔ بیوی ران کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ بولیں:

"یہ کہاں سے آئی؟"

ہم نے کہا "تمہارا اس وقت یہ پوچھنا بالکل فضول ہے، مہمان آچکے ہیں" ہماری بیوی کو یہ کمال حاصل ہے کہ کھانے پکانے کا کام آنکھ جھپکنے میں کرتی ہیں کہنے لگیں "فکر نہ کیجئے مہمانوں کو ذرا باتوں میں لگائیے، پندرہ منٹ کے اندر اندر کھانا تیار ہو جائے گا" ہم نہایت فاتحانہ انداز میں مہمانوں کے پاس آئے۔ بھائی اصغر مہدی اور بھابی عذرا نے ہمارے چہرے کے اطمینان کو دیکھ کر کہا: "بھائی مشکور! کیا بات ہے چشم زدن میں آپ کے چہرے میں ایک عجیب طرح کی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔"

ہم نے انجان بن کر پوچھا "میں آپ لوگوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"مطلب تو ہم بھی نہیں سمجھا سکتے" البتہ اتنا جانتے ہیں جب آپ اندر گئے اس وقت خاصے پریشان تھے، واپس آئے ہیں تو اس پریشانی کا ذرا سا شائبہ بھی آپ کے چہرے پر نظر نہیں آرہا ہے۔"

"حضرات یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ پہلے میں آپ لوگوں کے لئے پریشان تھا۔ آپ آگئے تو پریشانی خود بخود چلی گئی۔"

بھائی مہدی صاحب کا بیٹا عنبر بولا: "لیکن انکل ایک دفعہ آپ ہمیں دیکھ کر بہت پریشان ہو گئے تھے۔"

"نہیں نہیں بیٹا ایسی بات نہیں۔ میرے چہرے کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ میں زیادہ خوشی میں یوں معلوم ہونے لگتا ہوں جیسے بہت پریشان ہو گیا ہوں۔" کہنے کو تو ہم نے بھائی مہدی کے بیٹے کی بات کا جواب دے دیا، لیکن اس کے بعد ہم دوبارہ کچھ نروس ہو گئے۔ ادھر ساتھ ہمیں یہ خیال آرہا تھا کہ جب تک گوشت پک کر تیار نہیں ہو جاتا، مہمانوں کو مسلسل غپ شپ میں مصروف رکھنا ہے؛ چنانچہ بغیر سوچے سمجھے بھائی اصغر مہدی صاحب سے سوال کر ڈالا:

"کیوں بھائی صاحب! آپ خاصے تجربہ کار آدمی ہیں ذرا یہ تو بتائیے بکرے کے کس عمر میں ڈاڑھی نکلتی ہے؟"

"کیا فرمایا آپ نے؟" بھائی اصغر مہدی نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔ ان کی حیرانی سے

ہم مزید نروس ہو گئے۔

"میں نے عرض کیا ہے ایک بکرے کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہوتی ہے"؟

"جی!" بھائی مہدی صاحب نے جی کچھ اس زور دار انداز میں کہا کہ ہمارے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے، مگر ہم نے پھر بھی اپنے آپ کو سنبھال کر کہا: "بھائی صاحب آپ تو اس طرح حیران ہو رہے ہیں جیسے بکرا آپ نے کبھی دیکھا ہی نہیں"۔

"بکرا میں نے ضرور دیکھا ہے لیکن یقین کیجئے اس کی ڈاڑھی ناپنے کا شرف آج تک حاصل نہیں ہو سکا"۔ ہم اس عرصے میں اپنا سوال ہی بھول گئے، چنانچہ عرض کیا: "بکرے کی ڈاڑھی ناپنے کے لئے آپ سے کس مسخرے نے کہا ہے"؟

"میں پوچھتا ہوں بھائی مشکور آپ اس وقت کہاں ہیں"؟ بھائی اصغر مہدی ہماری بوکھلاہٹ کو سمجھ گئے۔

"بکرے کی ڈاڑھی میں اُلجھے ہوئے ہیں"۔ عذرا بھابی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"ارے ہاں بھائی صاحب! وہ ہماری سعیدہ بھابی کہاں ہیں"؟ ہم نے چونکہ اس سوال کے بارے میں پہلے سے کچھ سوچا نہیں تھا اس لئے ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دیا جائے بس ایکدم بول اٹھے "ہاں سعیدہ، جی ہاں سعیدہ، وہ جی ہاں سعیدہ"!

"واہ بھائی صاحب واہ، سعیدہ بھابی کی کیا خوب گردان فرمائی ہے — جی جناب میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ ہماری میزبان خاتون کہاں ہیں"؟

"آپ تشریف رکھئے وہ ابھی آ رہی ہیں"۔

"مجھے تشریف رکھے تو خاصی دیر ہو گئی ہے۔ آخر وہ ہیں کہاں"؟

"جی وہ آتی ہی ہوں گی"۔

"کیا مطلب وہ گھر پر نہیں ہیں"؟

"جی گھر پر ہی ہیں ..... میرا مطلب ہے، نہیں ہیں"۔

"یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں"؟ عذرا بھابی کے اس فقرے پر بھائی اصغر مہدی

صاحب بولے:

"دیکھو بیگم! بھائی مشکور صاحب مجھ سے بڑے ہیں اور اس طرح وہ تمہارے جیٹھ ہوئے ذرا ادب کے ساتھ بات کرو۔"

"جیٹھ جی، ہماری جٹھانی کہاں ہیں؟"

"پڑوس میں گئی ہیں ابھی آنے والی ہیں۔"

"پڑوس میں کیوں چلی گئیں؟"

"آپ کا انتظار کرتے کرتے جب بور ہو گئیں تو یہ سوچ کر۔۔۔"

"کیا سوچ کر؟ — اجی بھائی صاحب! کیا انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم لوگ آ رہے ہیں۔"

"بہت اچھی طرح معلوم تھا۔"

"پھر وہ چلی کیوں گئیں؟"

"میں اندر سے پوچھ کر آتا ہوں کہ وہ کیوں چلی گئیں۔"

"کس سے پوچھ کر آئیں گے؟"

"ملازمہ سے۔" ہم نے ایک اور جھوٹ بولا۔

"کل تک تو آپ کے کوئی ملازمہ نہیں تھی۔"

"آج صبح ہی آئی ہے۔" جھوٹ در جھوٹ۔

"عیدی کے طور پر؟" بھابی عذرا نے پوچھا اور ساتھ ہی اُٹھتے ہوئے کہنے لگیں:

"آپ تشریف رکھیں، ملازمہ سے میں خود پوچھ لیتی ہوں۔"

"ارے رے آپ اندر جانے کی بالکل تکلیف نہ کریں۔" ہم نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں؟"

"وہ کہتی تھی مجھے کوئی کام کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

"عجیب ملازمہ ہے، لیکن بھائی صاحب مجھے تو اس وقت آپ کے ہاتھ پاؤں پھولتے نظر آ رہے ہیں۔"

"آپ تشریف رکھئے میں اندر سے ہو کر ابھی آیا" یہ کہہ کر ہم جلدی سے بیوی کی خدمت میں پہنچے اور سارا ماجرا کہہ سُنایا کہ اب کیا کیا جائے بھابی عذرا اندر آنا چاہتی ہیں"

"اُف! ایسی غلطی نہ کر دیجئے، جیسے بھی بنے انہیں ڈرائنگ روم میں رُوکے رکھیئے"

"مگر کس طرح؟"

"توبہ اللہ۔ آپ یوں تو ہزاروں قسم کی باتیں بناتے رہتے ہیں لیکن اس موقع پر پانچ منٹ کے لئے مہمانوں کو باتوں میں مصروف نہیں رکھ سکتے۔ جائیے بھاگئے انہیں وہیں روکئے" ہم واپس ہوئے تو ہمیں دیکھتے ہی عذرا بھابی نے پوچھا:

"کیا فرماتی ہیں آپ کی ملازمہ؟"

"کہہ رہی ہیں مہمانوں کو اندر بالکل نہ آنے دیں، ورنہ کھانا تیار نہیں ہو سکے گا"

"کیا مطلب ابھی تک آپ کے ہاں کھانا تیار نہیں ہوا؟"

"بھئی آپ تو خود ایک خاتون ہیں۔ جانتی ہوں گی کہ کھانا تیار ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی چیز تیار ہونا باقی رہ جاتی ہے۔ سو وہی چیز تیار ہو رہی ہے"

"بہت خوب" عذرا بھابی یہ کہہ کر خاموش ہوئیں تو چند لمحوں کے لئے ساری محفل ہی خاموش ہو گئی۔ آخر بھائی اصغر مہدی صاحب نے جمود توڑا "بھائی مشکور کوئی بات کیجیے"

"جی ہاں ران تیار ہو رہی ہے" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کس کی ران؟"

"بکرے کی اور کیا ہاتھی کی ران تیار ہونا تھی" بھابی عذرا نے اپنے میاں کے سوال کا جواب دے دیا۔

"مگر بھائی مشکور صاحب کے کہنے کے مطابق کھانا تو پہلے سے پک چکا ہے" یہ کہہ کر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"کیوں بھائی مشکور؟"

"جی ہاں۔۔۔۔ جی ہاں آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ یہ تو ملازمہ کی ران۔۔۔۔"

"ہائیں! بھائی! یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے۔ کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہیں"

دونوں میاں بیوی بولے۔

میں نے اپنی دانست میں بات بناتے ہوئے کہا "معاف کیجئے میرا مطلب تھا کہ ملازمہ کی ران پک رہی ہے، یعنی اس کی ران پر پھوڑا نکل آیا ہے۔"

"مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟" بھابی عذرا نے مسکرا کر پوچھا۔ ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باورچی خانہ سے پریشر کوکر کی سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ عذرا فوراً بولیں "یہ لیجئے ابھی تو کھانا تیار ہو رہا ہے۔ بھائی مشکور آخر یہ قصّہ کیا ہے؟ ملازمہ پر باورچی خانہ چھوڑ کر خود سعیدہ بھابی کہاں چلی گئیں۔"

"کہیں بھی نہیں" میری زبان سے پھر نکلا۔

"تو کیا وہ اندر ہیں؟"

"نہیں تو" میں نے ڈھیٹ بن کر جواب دیا۔

"وہ کہیں گئی بھی نہیں، گھر میں بھی موجود نہیں، آخر سعیدہ بھابی ہیں کہاں؟"

"بس آپ دیکھتے رہیئے ابھی نمودار ہونے والی ہیں" میرے اس کہنے پر بھائی مہدی کی بیٹی شیبا بولی۔

"ارے امی ہمیں پتہ چل گیا۔ آنٹی کپڑے بدل رہی ہیں۔"

"واقعی بیگم! ہم سے عقلمند تو یہ بچے ہیں۔ شیبا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بھابی تیار ہو رہی ہوں گی۔"

"میں نے سوچا اس وقت لباس کا موضوع خوب درمیان میں آیا ہے۔ یہ ایسی بحث ہے جس میں خاصی دیر تک کیا مرد کیا عورت سبھی دلچسپی کے ساتھ حصّہ لے سکتے ہیں اور اپنی رائے دے سکتے ہیں، چنانچہ بھائی اصغر مہدی سے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا:

"بھائی صاحب! آج کل کی عورتوں کے لباس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

انہوں نے اس کا کوئی جواب دیا جس پر بھابی عذرا نے کچھ کہا اور پھر ان کی بیٹی اور بیٹا بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے، لیکن یہ لوگ کیا گفتگو کر رہے تھے مجھے کچھ علم نہ تھا۔ میں تو کھانے کی فکر میں غلطاں تھا۔ اچانک عذرا بھابی نے مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

"کیوں بھائی مشکور! آپ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں؟"

"جی ہاں آپ۔"

"میں سمجھتا ہوں بکریوں کے سر پر دوپٹہ ہونا بے حد ضروری ہے۔"

سب نے ایکدم قہقہہ لگایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو عذرا بھابی بولیں،

"اور بکروں کے سر پر کیا ہونا ضروری ہے؟"

"یہ بکرے درمیان میں کہاں سے آگئے" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"جہاں سے بکریوں کے سر پر دوپٹہ آیا تھا۔"

آخر میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا: "آپ لوگ باتیں کریں میں اس وقت ایک ضروری مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔"

"واہ صاحب واہ! یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ مہمان باتوں میں مصروف ہیں اور میزبان صاحب ضروری مسئلے پر غور فرما رہے ہیں۔" بھائی مہدی نے اصرار کیا۔ ۔ ۔ اور میں جواباً فریاد کناں ہوا:

"خدا کے لئے اس کا مطلب یہ نہ لیجیئے کہ میں آپ حضرات میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوں۔"

"بہت خوب۔ غور کر رہے ہیں ایک ضروری مسئلے پر اور دلچسپی لے رہے ہیں مہمانوں میں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ہو سکتا ہے جس مسئلے پر بھائی مشکور غور فرما رہے ہیں وہ ہم سے ہی متعلق ہو۔" عذرا بھابی نے میرے دل کی بات کہی۔ ان لوگوں نے دوبارہ لباس پر گفتگو شروع کر دی۔ میں پھر ذہنی طور پر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اس دفعہ عذرا بھابی نے مجھ سے مخاطب ہو کر اچانک پوچھ لیا۔ "ہاف پینٹ یعنی نیکر کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہوگا؟"

"جی!"

"کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردوں میں نیکر پہننے کا رواج نہیں رہا تو وہ اپنے جسم کو چھپانا چاہتے ہیں اور عورت کو برہنہ کر رہے ہیں۔ گویا مرد اپنے جسم کی دلکشی بڑھانا چاہتے

ہیں اور عورت کی دلکشی کو ختم کرنا چاہتے ہیں"۔

"جی"۔

"یہ آپ جی جی کیا کئے جا رہے ہیں۔ اصل مسئلے کے بارے میں کھل کر بات کیوں نہیں کرتے"۔

"اصل مسئلے کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں"۔

"بالکل"۔

"تو سُنیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ران تیار ہونے والی ہے"۔

"یہ آپ نے پھر ران کا ذکر کیا"۔ عذرا بھابی چلاّئیں۔

"کونسی ران کا"؟ میں نے جاگ کر پوچھا۔ عذرا بھابی قریب کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اب تو میں اندر باورچی خانے میں جا کر ضرور دیکھتی ہوں۔ یہ ملازمہ کیا کر رہی ہے اور باورچی خانہ کے بعد بھابی سعیدہ کے کمرے میں جاؤں گی۔ آخر انہوں نے ابھی تک لباس تبدیل کیوں نہیں کیا"۔

"میں انہیں اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا اصرار کرتے ہوئے باورچی خانہ کی طرف بھاگا۔ بیوی سے کہا "بھابی عذرا آرہی ہیں۔ تم کہیں باہر صحن میں چلی جاؤ"۔ سعیدہ نے کہا "پانچ دس منٹ میں کھانا تیار ہونے والا ہے"۔۔۔ میں نے کہا کچھ بھی ہو آپ ایک دفعہ باہر چلی جائیں۔ سعیدہ جاتے ہوئے کہنے لگی "جس وقت عذرا بھابی واپس ڈرائنگ روم میں پہنچ جائیں تو مجھے بلا لینا"۔ یہ کہہ کر سعیدہ صحن میں گئی اور اتنے میں عذرا بھابی باورچی خانہ میں آدھمکیں۔ وہاں میرے سوا کسی کو نہ پایا تو ہمارے کمرے کی طرف چل دیں۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہمارے کمرے میں بھی سعیدہ کو نہ پا کر وہ کہنے لگیں "آخر سعیدہ بھابی کہاں چلی گئیں"۔

"آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھئے بس آنے ہی والی ہیں"۔

عذرا بھابی ڈرائنگ روم میں آکر دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگئیں ـــ اُدھر میں بھی اپنی سوچ میں غرق ہو گیا۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میری ناک میں سالن جلنے کی بُو

آئی۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ سعیدہ باہر صحن میں کھڑی ہوگی۔ میں نے اسے اندر آنے کو نہیں کہا...
سعیدہ باورچی خانہ میں آئیں، تو ہنڈیا جل چکی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"میں کیا بتاؤں۔" سعیدہ بولی۔ اس پر عذرا بھابی نے باورچی خانہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ کوئی دوسرا سالن کھالیں گے۔"

"دوسرا سالن تو دال ہے۔"

"پھر تو مزہ آگیا۔ بقر عید کے دن گوشت تو سب لوگ کھاتے ہیں۔ آج ہم دال کھائیں گے اور اگر گوشت کی ایسی ہی خواہش ہوئی تو میں رات کو وہ ران روسٹ کرلوں گی جو بھائی مشکور کو ہم نے گھر میں داخل ہوتے وقت دی تھی۔"

اس ران کا ذکر آیا تو سعیدہ مجھے دیکھ رہی تھی اور میں سعیدہ کو۔ باقی اس دن ہمارے مہمانوں پر کیا گزری، اس مسئلے کو ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

اینٹ سٹیج سیکرٹری

غفار بھائی پہلے پہل ایک جلسہ کے اسٹیج سیکرٹری بنے تو اُنہوں نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سَرانجام دیئے۔ مَیں نے جلسے کے اختتام پر داد دی تو اُنہوں نے میری اس داد کو بطورِ خاص قبول نہیں فرمایا، کُچھ تو کسرِ نفسی کی بنا پر اور کچھ واقعی وہ سمجھتے تھے کہ اسٹیج سیکرٹری ہونا ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہر وہ شخص جو ذرا اعتماد کے ساتھ بول سکتا ہے' اسٹیج سیکرٹری بن سکتا ہے۔ اِدھر میرا خیال اور مشاہدہ یہ تھا کہ ہر شخص اسٹیج سیکرٹری نہیں بن سکتا اور اگر اُسے بنا بھی دیا جائے، تو وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سَرانجام نہیں دے سکتا، چنانچہ کئی مرتبہ بڑے گھاگ اور تجربہ کار قسم کے اسٹیج سیکرٹری حضرات کو دیکھا کہ اُنہیں بُلانا ہے 'الف' کو اور اُنہوں نے گھبرا کر بُلا لیا 'ب' کو اور عزت و توقیر کے افعال میں تو ان لوگوں سے اکثر غلطی ہو جاتی ہے، یعنی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اب فلاں صاحب تشریف لا کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور مُنہ سے نکل جاتا ہے اب فلاں صاحب حاضر ہو کر اپنے خیالات عرض کریں۔ اسی طرح کہنا یہ ہے کہ مَیں نے جو کچھ عرض کیا وہ قابلِ غور ہے اور زبان سے نکل رہا ہے کہ میں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ غرض میرے خیال میں اسٹیج سیکرٹری کی ذمہ داریاں خاصی مشکل اور اہم ہیں، مگر غفار بھائی دوسری مرتبہ ملے اور مَیں نے دوبارہ اُنہیں داد دی تو اُنہوں نے پھر بھی میری داد کی کوئی خاص قدر نہ کی۔

ایک دفعہ ایک تقریب کے ضمن میں مجھے اور غفار بھائی کو شیخوپورہ جانا پڑا۔ وہاں ایک اہم جلسہ ہو رہا تھا۔ اچانک مَیں اور وہ اُس میں جا پہنچے۔ ہمیں دیکھ کر جلسہ کے اسٹیج سیکرٹری خوش

ہو گئے۔ اس لئے نہیں کہ ہم کوئی خاص اہم اور مشہور آدمی تھے، بلکہ غالباً اس لئے کہ اُس جلسے میں سامعین تو خاصی تعداد میں آ چکے تھے، مقررین ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ ہماری آمد پر ایک تو اسٹیج سیکرٹری صاحب نے یہی کیا کہ دو چار نعرۂ تکبیر لگوا دیئے۔ اگرچہ اسلامی زبان میں یہ ہمارا استقبال تھا، لیکن پھر بھی ہمیں اور خود حاضرین کرام کو یہ بات کچھ مناسب معلوم نہ ہوئی۔ ہم دونوں اگر صاحبانِ ریش ہوتے، تو شاید اسٹیج سیکرٹری کی یہ بدعت برداشت کر لی جاتی، مگر ہمارا حال یہ تھا کہ ڈاڑھی ایک طرف ہم نے لباس بھی خالص انگریزی پہن رکھا تھا۔

صدیقی بولے: "اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

"کس سے؟"

"جو کچھ تم کہہ رہے تھے۔"

"میں کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے پوچھا

"یہی تو میرے یاد نہیں رہا۔"

"یاد کی بات نہیں پیارے، تم میری باتیں غور سے نہیں سن رہے تھے۔"

"بڑے غور سے سن رہا تھا۔"

"یہ بات ہے تو بتاتے کیوں نہیں میں کیا کہہ رہا تھا۔"

صدیقی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "یاد آ گیا تم ڈاڑھی اور انگریزی لباس کا ذکر کر رہے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، ڈاڑھی بھی ہو سکتی ہے اور انگریزی لباس بھی اور ان میں سے ایک چیز بھی کافی ہے۔"

"کس بات کے لئے؟" میں نے پوچھا۔

"یار میرا امتحان کیوں لے رہے ہو۔ تم ایک جلسے کا ذکر کر رہے تھے۔ اس میں جیسے ہی تم شریک ہوئے اسٹیج سیکرٹری نے نعرۂ تکبیر لگوا دیا۔ تمہارا خیال ہے اُسے یہ نعرہ نہیں لگوانا چاہیئے تھا۔"

"ہاں میرا یہی خیال ہے۔"

"تو کیا تم یہ چاہتے تھے کہ نعرۂ تکبیر کے بجائے تمہاری آمد پر لاحول پڑھی جاتی۔"

"آخر کچھ پڑھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"جلسے میں گرمی پیدا کرنے کے لئے۔" صدیقی نے مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔ مگر میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ اُس دن اسٹیج سیکرٹری کو ہماری آمد پر نعرے لگوانے کی قطعی ضرورت نہ تھی نعرے لگوانے کی وجہ ہی سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھُولے تھے ورنہ اِس سے قبل وہ اچھے خاصے انداز میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

"تمہارے خیال میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض کیا ہیں۔" صدیقی نے پھر لُقمہ دیا۔

"حاضرین، مقررین اور صدر جلسہ کا خیال رکھنا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ خوش رہیں، کیونکہ اگر ان میں سے ایک بھی ناراض ہو جائے، تو جلسے کا ستیاناس ہو سکتا ہے یا ہو جاتا ہے۔"

"مثلاً اگر صدرِ جلسہ ناراض ہو جائے، تو جلسے میں کیا خرابی واقع ہو سکتی ہے؟"

"پہلی بات تو یہی ہے کہ صدرِ جلسہ کی ناراضی کے باعث اسٹیج سیکرٹری کا سکونِ قلب خاک میں مِل جاتا ہے۔"

"کیا خیال ہے اگر حاضرین ناراض ہو جائیں تو سکونِ قلب برقرار رہے گا؟"

"مَیں نے یہ کب کہا ہے۔"

"کہا تو نہیں، لیکن تمہاری باتوں سے کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے تم صدرِ جلسہ کو زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔"

"قطعی نہیں۔"

"بس تو پھر پیارے یہ مان لو اسٹیج سیکرٹری کے لئے خواہ وقتی طور پر ہی سہی، سب سے کم مضر صدرِ جلسہ ہوتا ہے۔" صدیقی نے میز پر مکّہ مارتے ہوئے کہا اور واقعی مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہمارے دوست مولانا ص۔ض ایک جلسے میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام

دے رہے تھے۔ کُرسیٔ صدارت پر ایک وزیر صاحب براجمان تھے۔ جلسہ اپنے عروج پر تھا کہ ہم نے دیکھا صاحبِ صدر نے مولانا کے کان میں کچھ کہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو مولانا نے اس اشارہ کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا، مگر جب وزیر صاحب اپنی انگشتِ شہادت کو مسلسل ہلاتے رہے تو آخر کار مولانا نے بڑی بے دِلی سے اپنا کان اُن کے مُنہ کی طرف کر دیا۔ مولانا نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے جلسہ کی کارروائی جاری رکھی۔ چند منٹ بعد صاحبِ صدر نے مولانا کو پھر دعوت سرگوشی دی۔ انہوں نے ذرا پروا نہیں کی۔ صاحبِ صدر خاصے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا ممکن ہے صاحبِ صدر اس وقت کھانے پینے کی کوئی چیز طلب فرما رہے ہوں اور چونکہ مولانا اسٹیج سیکرٹری کے فرائض میں مصروف ہیں۔ انہیں اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں، کیوں نہ میں اُٹھ کر صاحبِ صدر کے قریب پہنچ جاؤں اور مولانا کے کانوں کے بجائے اپنے کان اُن کے مُنہ کے قریب کر دُوں؛ چنانچہ پاس جاکر پُوچھا۔ "قبلہ کِس چیز کی ضرورت ہے؟"

"مَیں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اسٹیج سیکرٹری صاحب ہی سے کُچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر یہ حضرت سُنتے ہی نہیں۔"

"مُجھ سے فرمایئے کیا حُکم ہے؟" میرے اِس پُرخلوص سوال کے جواب میں صاحبِ صدر نے اُلٹا ناراض ہو کر کہا:

"آپ اپنی جگہ جا کر اُسی طرح بیٹھ جائیں جیسے پہلے بیٹھے تھے۔" غالباً صاحبِ صدر اسٹیج سیکرٹری صاحب کے رویّے سے سخت نالاں تھے۔ ہم نے اپنی دانست میں بڑی جُرأت سے کام لیتے ہوئے مولانا ص۔ ض سے کہہ ڈالا؛ "حضرت! کچھ معلوم ہے صاحبِ صدر کس لئے بے چین ہیں؟"

"صاحبِ صدر پاگل ہو گئے ہیں۔" مولانا نے بتایا۔

"جی؟"

"اس میں حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مگر آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟"

"صاحبِ صدر پاگل نہیں ہو گئے تو اور کیا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں جلسے کو جلدی ختم کراؤ۔ ایک اور تقریب میں شریک ہونا ہے"۔

"اس میں پاگل ہونے والی کیا بات ہے؟ واقعی صاحبِ صدر کو کہیں جانا ہوگا"۔

"میں کہتا ہوں کہیں اور جانا تھا تو یہاں کیوں آئے؟"

"بھلے آدمی! یہ خود تو نہیں آئے۔ تمہی نے بلایا ہوگا"۔

"یقین کرو میں نے انہیں دعوت نہیں دی"۔

"خیر یہ بات رہنے دو۔ صدارت کے لئے جلسہ کرانے والے ہی مجبور کیا کرتے ہیں"۔

"مگر یہ صاحب صدارت کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے بڑے بے چین رہتے ہیں"۔

"بہر حال میں صاحبِ صدر سے کہہ رہا ہوں . . ."۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی کہ جلسہ جلدی ختم کرا دیا جائے گا"۔

مولانا ص۔ض میرے اس کہنے پر سینہ تان کر بولے "جلسہ جلدی ختم کرانے والے آپ کون ہوتے ہیں جی!"

"میں ہوں آپ کا دوست . . ."۔

"اس وقت میں کسی دوست کو نہیں جانتا۔ جلسے کو باعزت طریقے سے آخر تک پہنچانا میرا فرض ہے"۔

"اور اگر صاحبِ صدر کھڑے ہو کر جلسے کے خاتمہ کا اعلان کر دیں . . . پھر . . .؟"

"وہ الگ بات ہے مگر صاحبِ صدر ایسا نہیں کریں گے"۔

"کیوں؟"

"وہ ایک سیاست دان ہیں"۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ صاحبِ صدر چپکے سے اُٹھ کر پنڈال سے باہر نکل گئے۔ مولانا ص۔ض کو بہت غصہ آیا، لیکن خون کے گھونٹ سے پی کر خاموش ہو گئے"۔

"جلسے کی کارروائی تو جاری رہی"۔ صدیقی نے پوچھا۔

"جی ہاں وہ تو جاری رہی"۔

"بس تو پھر میری بات صحیح ثابت ہوئی نا کہ صاحبِ صدر کی ناراضی جلسے کے لئے اتنی نقصان دہ نہیں رہتی"۔

"مگر پیارے وہ لُطف تو برقرار نہیں رہتا"۔

"لُطف کی بات چھوڑیئے۔ ہاں تو آپ شیخوپورہ کے ایک جلسے کا حال سُنا رہے تھے وہ سنایئے"۔ صدیقی نے بحث و تکرار سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ میں نے شیخوپورہ کے جلسے کا حال دوبارہ بیان کرنا شروع کر دیا۔"

یہ جلسہ ایک بُزرگ حضرت لافانی کی برسی کے موقع پر منعقد کیا جا رہا تھا۔ اِس جلسے میں حضرت لافانی کے فاضل فرزند حضرت لاثانی بھی کراچی سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں اور غفار بھائی ابھی آرام سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ اسٹیج سیکرٹری نے ایک مقرّر کی تقریر ختم ہونے کے بعد اعلان کیا۔ حاضرینِ کرام! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اِس وقت اتفاق سے یا یوں کہیئے کہ ہماری بدقسمتی سے اوہ معاف کیجئے ہماری خوش قسمتی سے ہمارے ملک کے ایک نوخیز . . . نہیں . . . نہیں . . . اُبھرتے ہوئے . . . میرا مطلب ہے کلی کی طرح چٹکتے ہوئے . . . شاید میں نے غلط کہا . . . . کرن کی طرح پھُوٹتے ہوئے . . . . لاحول ولاقوۃ شاید میں اب بھی اپنا مفہوم ادا نہیں ادا کر سکا ہوں بس یوں سمجھیئے کہ ہمارے ملک کے نوجوان ادیب جناب مشکور حسین یاد ادھر آ نکلے ہیں تو میں اب اپنے اِس ادیب سے درخواست کروں گا کہ وہ اسٹیج پر تشریف لا کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں"۔ اسٹیج سیکرٹری صاحب کے اِس اعلان کے بعد میں مائیک کے سامنے آگیا اور حاضرین سے کہا کہ اسٹیج سیکرٹری صاحب نے یوں تو میری شان میں بہت سے تعریف کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، لیکن ان سب میں مجھے جو لفظ سب سے زیادہ پسند آیا ہے وہ نوجوان ہے۔ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اب آپ حضرات خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ میں کس حد تک نوجوان ہوں یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے اسٹیج سیکرٹری صاحب کو میں اگر ایک نوجوان دکھائی دیا ہوں تو کوئی عجب نہیں کہ آپ کو ایک معمولی چھوکرے سے زیادہ نظر نہ آؤں۔ میرے اِن الفاظ پر محفل میں قہقہے بلند ہو گئے، لیکن میں نے دیکھا کہ بے چارے اسٹیج

سیکرٹری خاصے بوکھلا گئے، حالانکہ انہیں بوکھلانے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ مَیں اپنے طور پر معمولی سا مذاق کر رہا تھا۔ ویسے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اسٹیج سیکرٹری کی نیّت خراب نہ تھی۔ وہ خلوصِ دل کے ساتھ حاضرینِ جلسہ سے میرا تعارف کرانا چاہتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی زبان سے وہ الفاظ برآمد نہ ہو سکے جو اُن کے دِل میں تھے۔ غالباً وہ میرے بارے میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ مَیں ایک معروف شخص ہوں۔ بہرحال اسٹیج سیکرٹری صاحب کے تعارف سے مجھے قطعی کوئی غلط احساس نہ ہوا تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ مَیں نے اُن کے الفاظ سے ہرگز ہرگز بُرا نہ مانا تھا۔ اسی اثنا میں اسٹیج سیکرٹری صاحب کے چہرے پر میری نظر پڑی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کھوئے سے گئے ہیں اور انہیں اِس بات کا بے حد ملال ہو رہا ہے کہ میرے بارے میں صحیح الفاظ استعمال کیوں نہ کر سکے۔ اسٹیج سیکرٹری اسی طرح گم شدہ سے بیٹھے تھے کہ مَیں نے چند جملوں میں اپنی بات کہی اور اسٹیج سے اُتر آیا۔ اسٹیج سیکرٹری ہڑبڑا کر اُٹھے اور مائیک کے سامنے آ کر کہنے لگے: "یہ تھے مشکور حسین یاد۔" اس سے آگے وہ حاضرینِ جلسہ سے کہنا یہ چاہتے تھے کہ جن بزرگ کی برسی منائی جارہی ہے اُن کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھ دیجئے اس کے بجائے انہوں نے اُن کے بیٹے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: "اب مَیں آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ مرحوم کے بیٹے کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لئے ایک سورۂ فاتحہ پڑھیں۔" یہ سُنتے ہی محفل میں قہقہے بلند ہوئے۔ ابھی لوگ ان قہقہوں سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ سیکرٹری صاحب نے بوکھلا کر دوسری دعوتِ قہقہہ دے ڈالی۔ اس دفعہ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ مرحوم بزرگ کے بیٹے اسٹیج پر تشریف لا کر اظہارِ خیال فرمائیں۔ اِس کے بجائے سیکرٹری صاحب نے بوکھلاہٹ میں یہ کہہ ڈالا کہ اب مَیں مرحوم کی خدمت میں درخواست گذار ہوں کہ وہ خود اسٹیج پر آ کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ محفل کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ اگرچہ وہ جلسہ تعزیت کا تھا، لیکن اسٹیج سیکرٹری کی بوکھلاہٹ کی وجہ سے جلسۂ تعزیت کے بجائے جلسۂ زعفران بن گیا۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سیکرٹری صاحب کو اپنی بوکھلاہٹ پر غصّہ آتا اور وہ اپنے آپ کو توازن میں لاتے، لیکن ہوا یہ کہ سیکرٹری صاحب کو حاضرین پر غصہ آ گیا۔ بڑے اعتماد سے کہنے لگے: "حضرات کس قدر افسوس کا مقام

ہے کہ اس جلسۂ تعزیت میں اوّل تو آپ کو رونا چاہیئے، چلیئے اگر آنسو نہیں آرہے تھے تو کم از کم آپ لوگ سر جھکا کر خاموش ہی بیٹھ جاتے، لیکن اس کے بجائے آپ تو قہقہے لگا رہے ہیں۔ مَیں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہنسنے اور کھیں کھیں کرنے کے بجائے خاموش ہو جائیں۔ لوگ خاموش ہوئے تو اسٹیج سیکرٹری صاحب نے ایسی ہی کوئی اور فضول بات کر دی۔ غرض اُس کے بعد جلسہ قابو میں نہ آیا۔ جن بزرگ کی تعزیت میں یہ جلسہ ہو رہا تھا اُن کے مشہور و معروف فرزند بھی اور دوسرے اعزا بھی اُن بزرگ پر رونے کے بجائے جلسے کی حالتِ زار پر روتے ہوئے جلسے سے باہر نکل گئے۔ اگرچہ اسٹیج سیکرٹری بار بار مائیک پر اُن سے درخواست کرتا رہا کہ اے مرحوم کے عزیزانِ گرامی آپ ناراض ہو کر نہ جائیں جلسہ کے حاضرین خاموش ہو گئے ہیں اب وہ مرحوم پر رونے کے لئے بھی تیار ہیں۔ واللہ آ کر دیکھ لیجیئے وہ اس وقت کفِ افسوس بھی مَل رہے ہیں، لیکن مرحوم کے عزیزوں نے ایک نہ سُنی اور لاحول پڑھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جلسہ ختم ہوا اور ہم اُس جلسہ سے واپس ہونے لگے، تو مَیں نے غفار بھائی سے کہا "دیکھا آپ نے؟ اسٹیج سیکرٹری خود کو نہ سنبھال سکے، تو جلسہ کا حال کس طرح خراب ہوتا ہے۔"

بولے "آپ کی بات کسی حد تک صحیح ہے۔"

"یعنی ابھی کسی حد تک ہی صحیح ہے پُوری طرح نہیں؟"

"جی نہیں۔" غفار بھائی نے کہا اور اس واقعہ کے چند روز بعد ہی ہمیں ایک دوسرے جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس جلسے کے اسٹیج سیکرٹری گھبرائے ہوئے تو قطعی نہیں تھے۔ بڑے وثوق کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے، ان کی آواز بھی زور دار تھی، لیکن ان میں خود اعتمادی کچھ زیادہ ہی سرایت کر گئی تھی۔ ایک بزرگ کو دعوتِ اظہار انہوں نے اچھے خاصے الفاظ میں دی، لیکن جیسے ہی وہ بزرگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسٹیج پر آنے لگے تو سیکرٹری صاحب نے مزید خود اعتمادی اور بے تکلفی دکھانے کے لئے چٹکی بجاتے ہوئے اُن سے کہا: "پیارے ذرا جلدی آؤ۔" وہ بزرگ یہ الفاظ سُن کر ایک دفعہ تو اسٹیج سیکرٹری کو گھورتے کے گھورتے رہ گئے۔ اِن بزرگ کے بعد ایک معمر خاتون کو اظہارِ خیال کے لئے اسٹیج پر آنا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسٹیج پر آنے لگیں تو انہیں بھی سیکرٹری صاحب نے اسی طرح مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "بنّو! ذرا تیز تیز قدم اُٹھا کر آؤ نا"۔ واضح رہے کہ خود اِن اسٹیج سیکرٹری صاحب کی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ یہ حضرت کچھ اِس قدر خود اعتماد اسٹیج سیکرٹری واقع ہوئے تھے کہ تقریر کرنے والے کو تقریر سے پہلے اور بعد میں شاباش کے طور پر تھپکی ضرور دیتے تھے۔ ایک بزرگ مقرر نے اُن کی پہلی تھپکی تو برداشت کر لی لیکن جب وہ تقریر کے بعد اُن کی کمر پر تھپکی نمبر ۲ دینے لگے تو اُنہوں نے سینہ تان کر کہا "برخوردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے تمہاری عمر کے اِس وقت میرے تین چار پوتے پوتیاں ہیں"۔ یہ اسٹیج سیکرٹری صاحب بھی ایک ہی تھے پہلے تو اُن بزرگ سے معافی چاہی اور جب وہ چلنے لگے تو دوسری بار کمر پر تھپکی مارتے ہوئے کہا "شاباش آپ کی تقریر بہت عمدہ تھی"۔ وہ بزرگ غصّے میں لرزتے ہوئے "ہوں" کر کے اسٹیج سے نیچے اُتر آئے اور پھر ایک دفعہ تو اِن اسٹیج سیکرٹری صاحب نے کمال ہی کر دکھایا ایک خاتون تقریر کرنے کے لئے مائیک کے سامنے آئیں تو اُن سے کہنے لگے "پیاری! اِتنا بھی کیا شرمانا، ذرا گھونگٹ تو پیچھے کر لو، بالکل دُلہن معلوم ہو رہی ہو"۔ یہ سُننا تھا کہ اُس خاتون کا شوہر اور دوسرے رشتے دار کُود کر اسٹیج پر آگئے اور مشکل سے ہنگامہ ہوتے ہوتے بچا۔

مَیں نے غفار بھائی سے کہا "اب تو آپ مانتے ہیں کہ ہر شخص اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتا"۔

کہنے لگے "مَیں تو اپنا آخری فیصلہ اُس وقت سناؤں گا جب آپ کو اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے دیکھ لوں گا"۔

عرض کیا "اگر یہ بات ہے تو سمجھ لیجئے مجھے دیکھنے کے بعد کسی دوسرے اسٹیج سیکرٹری کو دیکھنے اور یاد رکھنے کی تمنا آپ کے دِل میں باقی نہ رہے گی"۔ آج کل غفار بھائی میرے لئے کسی جلسے کا انتظام کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں۔

موذی کی موت

اتوار کا دن تھا اور ننھی حوریہ سے لے کر نانی اماں تک ہم سب نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ آج اس موذی کا خاتمہ کر کے ہی دم لیں گے، مگر اس وقت مسئلہ یہ درپیش تھا کہ آخر وہ ہے کہاں؟ پہلے دیر تک سارا کنبہ ڈرائنگ رُوم اور کھانے کے کمرے میں بیٹھا انتظار کرتا رہا، مگر اس کی کوئی آواز کیا ذرا سی سرسراہٹ بھی کانوں میں نہیں آئی۔ آپ خود ہی غور فرمایئے سارے گھر کا دم سادھ کر چُپ بیٹھے رہنا کہاں تک ممکن ہے۔ بولنا تو بڑی بات ہے ذرا کوئی اشارہ بھی کرتا تھا تو نانی اماں کھانے کو آتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ موذی بڑا ہوشیار ہے۔ باتیں کرو گے تو کبھی پاس نہ پھٹکے گا۔ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ کر جمائیاں لینے اور ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر کافی دیر تک دیکھنے کے بعد ہم لوگ کامن رُوم میں آ گئے۔

کامن رُوم میں آ کر سب نے محسوس کیا کہ گھات میں بیٹھنے کی اصل جگہ یہی تھی۔ ڈرائنگ رُوم میں جتنی دیر بھی بیٹھے رہے وقت ہی ضائع گیا۔ وجہ یہ تھی کہ کامن رُوم میں ہر کمرے کا دروازہ کھُلتا تھا۔ گویا یہاں بیٹھ کر تمام کمروں کا جائزہ لینا آسان تھا۔ کچھ دیر کے بعد پتہ چلا کہ کامن رُوم میں بیٹھ کر بھی اس موذی کا صحیح ٹھکانہ معلوم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہر کمرے سے کسی نہ کسی قسم کی آواز آ جاتی تھی اور سب کے کان اس آواز پر لگ جاتے۔ پھر یہ خیال آتا کہ آخر وہ اکیلا ہے تمام کمروں میں ایک ہی وقت میں کیسے موجود ہو سکتا ہے۔ نانی اماں بولیں: "ارے بے وقوفو! آج وہ اکیلا نہیں، اپنا کنبہ بھی ساتھ لے آیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو مر گئے۔" پوپل نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔

"اس میں مرنے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اس موذی کے سارے خاندان کو تباہ کردیں گے۔" شریر ٹوکیو نے سینہ تان کر جواب دیا۔

شنگھائی بولا: "رہنے دو یار۔ تم سے ایک موذی تو آج تک مرا نہیں۔ پورے خاندان کو کیسے مار ڈالو گے۔" ٹوکیو ابھی اس فقرے کا جواب دینے ہی والا تھا کہ برابر کے کمرے سے ایک خاص قسم کی آواز آئی۔ سب نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس آواز کے بارے میں اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ پھوپھا نقی نے سب کی توجہ ایک خاص مسئلے کی طرف مبذول کرائی۔ وہ بولے: "کیوں صاحبان! فرض کر لیجئے دشمن اس وقت آجاتا ہے تو بتایئے آپ کس چیز سے اس کا مقابلہ کریں گے؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا: "ارے ہاں واقعی ہم لوگ تو بالکل نہتے بیٹھے ہیں۔"

نانی اماں سب کی بات کاٹ کر بولیں "لیکن میں نہتی نہیں ہوں۔" اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنی سلیم شاہی جوتی کو فضا میں بلند کیا۔

ٹوکیو نے پوچھا: "نانی اماں! آپ اس جوتی سے موذی کو ہلاک کریں گی؟"

"برخوردار! جوتی تو بڑی چیز ہے، میں تو اس کی نوک سے موذی کا بھرکس نکال سکتی ہوں۔"

"ایسے کہہ رہی ہیں جیسے اس سے پہلے آپ اس جوتی سے کئی موذی ہلاک کر چکی ہیں۔" ہانگ کانگ نے لقمہ دیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" نانی اماں نے ہلتی ہوئی گردن کو مزید ہلا کر کہا۔ اسی کمرے سے پھر آواز آئی، بلکہ آواز کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ موذی غصے میں ہے۔ والد صاحب فوراً بولے: "نقی بھائی کے مشورے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔" اور بغیر کچھ سوچے سمجھے قبلہ گاہی کے اس ارشاد پر سب گھر والے اپنے اپنے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ لے کر تیار ہو گئے۔ مثال کے طور پر والدہ صاحبہ کے سامنے پاندان رکھا تھا انہوں نے اس میں سے سروتا نکال لیا۔ ٹوکیو نے ہاکی سنبھال لی۔ شنگھائی کے ہاتھ میں چولھے کی بقایا جلی ہوئی لکڑی تھی۔ ننھی حوریہ نے مچھر دانی کا بانس پکڑ رکھا تھا، چھوٹے پیکن کو اس وقت بڑے بھائی کی غلیل مل سکی، اس نے اسی کو غنیمت سمجھا اور وہ اس میں غلّہ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ پوپل کو اور کچھ نظر نہ آیا تو اس نے ٹوٹی ہوئی ڈوئی اٹھا لی۔ والد

صاحب کے حصّے میں مسالہ پیسنے کی کٹھالی کا موسل آیا۔ مجھے خالی ہاتھ کھڑا دیکھ کر سب نے شور مچایا۔ "ارے گھمنڈو کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" آخر میرے ہاتھ میں لوہے کا ایک سریا تھما دیا گیا۔ ہانگ کانگ نے ٹوٹے ہوئے پلنگ کا ایک پایہ اُٹھا لیا۔

جب اچھی طرح تصدیق ہو چکی کہ موذی اسی کمرے میں ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اسے مارنے کے لئے کون کون کمرے کے اندر جائے اور کون باہر کھڑا رہے۔ نانی اماں نے فیصلہ سنایا: "میں تو باہر عین دروازے کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔"

والد صاحب بولے "مگر اماں آپ دروازے کے پاس بیٹھ گئیں تو باقی لوگ موذی پر حملہ آور کیسے ہوں گے۔ میرا خیال ہے اوّل تو آپ تکلیف ہی نہ فرمائیں، اگر اس مہم میں ہمارے ساتھ شریک ہونے کا بہت ہی خیال ہے تو آپ اسی جگہ ہاتھ میں جُوتی لئے تشریف رکھیں۔ جیسے ہی موذی ہم لوگوں سے بچ کر اِدھر کو آئے، آپ اس کا کام تمام کر ڈالیں۔" پہلے تو نانی اماں نے اِس تجویز کو اپنے لئے ایک چیلنج خیال کیا۔ وہ سمجھیں بڑھاپے کی وجہ سے انہیں بیٹھے رہنے کے لئے کہا گیا ہے، مگر پھر خود ہی کچھ غور کر کے رضامند ہو گئیں۔

ہم لوگ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کون کمرے کے اندر جائے اور کون باہر کھڑا رہے کہ اتنے میں پوپل نے شور مچایا۔ "موذی آ گیا... موذی آ گیا..." دھڑ... دھڑام... دھول... ٹھا... ٹھوں... وھپ... ٹن... ترٹم... جس کے پاس جو کچھ تھا اُس نے چلانا شروع کر دیا کہ اتنے میں نانی اماں کی چیخ سُنائی دی۔ "یا اللہ میں مر گئی۔" ہر کوئی موذی پر حملہ آور ہونے کا خیال چھوڑ کر نانی اماں کے گرد آ کھڑا ہوا۔ نانی اماں دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر کا پچھلا حصّہ دبائے بیٹھی تھیں۔ والد صاحب بولے: "اماں! شاباش اسی طرح موذی کو دبوچے بیٹھی رہیئے۔ ہم اسے پکڑ لیتے ہیں۔ پھر آپ اپنے ہاتھ اِس جگہ سے ہٹا لیجئے گا۔" والد صاحب کے اِس فقرے پر ہماری سمجھ میں بات آئی کہ معاملہ کیا ہے۔ موذی ہم سب لوگوں کو غچّہ دے کر نانی اماں کی قمیص میں گھُس گیا اور اب وہ اسے دبوچے بیٹھی تھیں۔ نانی اماں ہائے ہائے کر رہی تھیں اور والد صاحب انہیں حوصلہ دیئے جا رہے تھے کہ اماں بے فکر رہیئے۔ اوّل تو موذی آپ کو کاٹے گا نہیں اور اگر کاٹے گا بھی تو اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہو گا۔" نانی اماں بے چاری برابر

ہائے ہائے کیئے جا رہی تھیں، لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے ہاتھ ہٹا کر موذی کو اپنے قابو میں کرلے۔ ویسے دل ہی دل میں سب خوش تھے کہ موذی کس طرح جلدی سے پکڑا گیا۔ نانی اماں نے جب دیکھا کہ تمام گھر والے ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں، لیکن کوئی کرتا کچھ بھی نہیں تو انہوں نے چلاتے ہوئے کہا: "میرے پاس سے سب دُور ہو جاؤ۔ مَیں مَر رہی ہوں، لیکن میری کسی کو پروا نہیں۔" والدہ صاحبہ بولیں: "امّی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ مَیں موذی کو قابو کرتی ہوں۔" نانی اماں نے کمر سے اپنے دونوں ہاتھ الگ کرلئے، اُدھر فوراً امّی نے اسی جگہ اپنے دونوں ہاتھ کٹوری بنا کر رکھ دیئے، لیکن نانی اماں گردن اُونچی کر کے کہہ رہی تھیں "وہ کونسا موذی؟" ہانگ کانگ بولا: "وہی موذی جو اس وقت آپ کی قمیص کے اندر آپ کی کمر پر چڑھا بیٹھا ہے۔"

"ارے تو کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ موذی میری قمیص میں گھُس گیا ہے؟"

"موذی نہیں تو کیا آپ کی قمیص میں شیر گھُس آیا۔" ٹوکیو نے طنز کی جس پر نانی اماں نے اس کی طرف اپنی سلیم شاہی جُوتی کھینچ کر ماری۔ والد صاحب نے والدہ صاحبہ سے آہستگی میں پُوچھا: "کیوں جی! موذی دم سادھے بیٹھا ہے یا پھُدک رہا ہے؟" یہ سُن کر نانی اماں والد صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ "ارے میاں تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میری تو جان نکل رہی ہے، لیکن جانے تم لوگ کس خیال میں ہو۔" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب وقت موذی کمرے سے نکل کر بھاگا، تو اس وقت سب لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ پیکن نے بھی اپنی غلیل چلا ڈالی۔ غلیل کا غلّہ موذی کے تو کیا لگنا تھا، بے چاری نانی اماں کی کمر میں زنّاٹے کے ساتھ آلگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر دبوچ کر بیٹھ گئیں جسے سب نے یہ سمجھا کہ موذی نانی اماں کی قمیص میں گھُس گیا ہے۔ اس پر والدہ صاحبہ نانی اماں کی کمر سہلانے میں مصروف ہو گئیں اور باقی تمام افراد کو دوبارہ یہ فکر لاحق ہوئی کہ آخر اب موذی کون سے کمرے میں ہو سکتا ہے۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ موذی کہیں نہیں گیا۔ عین سامنے والے کمرے میں چھُپا بیٹھا ہے، کیونکہ جب وہ کمرے سے نکل کر بھاگا تھا، اسے اچھی طرح دیکھا تھا اور اس وقت اس کا رُخ بالکل سامنے والے کمرے کی طرف تھا۔ پوپل کہنے لگی: "ابّا جان! اگر موذی کا رُخ عین سامنے والے کمرے کی طرف تھا پھر تو وہ یقیناً"

نانی اماں کے اوپر سے کود کر وہاں گیا ہے اور بیگن نے غلیل صحیح چلائی تھی۔ ممکن ہے غلّہ بھی اس کے لگا ہو۔" اس پر نانی اماں چلائیں۔" ہاں تو پھر کہہ دو کہ میں خواہ مخواہ درد سے چیخ رہی ہوں غلّہ میرے نہیں لگا موذی کے لگا تھا اور... اور... میری کمر پر جو نیل پڑ گیا ہے۔ یہ بھی جھوٹ موٹ کا ہے۔" والدہ صاحبہ نے کہا: "اماں آپ ان بچّوں کی باتوں کا کیوں خیال کرتی ہیں۔"

تھوڑی سی بحث وتمحیص کے بعد سامنے والے کمرے میں موذی کی دوبارہ تلاش شروع ہو گئی۔ بکس سرکائے جا رہے ہیں۔ صندوق کھولے جا رہے ہیں۔ کپڑے اُلٹ پلٹ کئے جا رہے ہیں۔ جیسے ہی نانی اماں کی نظر اپنی صندوقچی پر پڑی، انہوں نے فوراً للکار کر کہا: "خبردار! جو کسی نے میری صندوقچی کو ہاتھ لگایا۔"

"لیکن نانی اماں! اس کا کیا علاج کہ موذی کے اُچھلنے اور کودنے کی آواز اسی میں سے آ رہی ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔ میری صندوقچی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

"دیکھ لیجئے نانی اماں! اگر موذی نے آپ کے قیمتی کاغذات کتر ڈالے، تو پھر ہمیں کچھ نہ کہیئے گا۔"

کاغذات کا لفظ سُنا، تو نانی اماں کے کان کھڑے ہوئے۔" ارے بچو! کیا واقعی تمہیں یقین ہے کہ موذی میری صندوقچی میں گھس گیا ہے؟"

"اندر کی کھڑبڑ سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔" ٹوکیو نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرو احتیاط کے ساتھ اس کا ڈھکنا اُٹھانا۔ تم جانتے ہو اس کی کُنڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور میں نے اس کے چاروں طرف ڈوری لپیٹ رکھی ہے۔ جلدی میں ڈوری بھی توڑ نہ ڈالنا۔ سمجھے۔"

سامنے والے کمرے کی اچھی طرح چھان بین کی گئی، مگر موذی کا کچھ پتہ نہ چلا؛ البتہ ٹوکیو اور شنگھائی بہت خوش تھے کہ ایک کا گم شدہ لٹو اور دوسرے کی گیند مل گئی تھی۔ یہ دونوں موذی کو بھول کر اپنی اپنی چیزوں سے کھیلنے میں مگن ہو گئے۔ والد صاحب نے ڈانٹ پلائی۔" موذی کو ہلاک کرنے کی مہم بھول کر یہ کھیلنے کا پروگرام کیا معنی؟ ارے اگر وہ اس کمرے میں نہیں ملا؛ تو برابر والے

کمرے میں تلاش کرو۔ یاد رہے کہ آج اس کا خاتمہ کر کے دَم لینا ہے۔ پُورے ایک ہفتے سے اس نے گھر بھر کی نیند حرام کر رکھی ہے۔"

سب لوگ برابر والے کمرے میں موذی کو تلاش کرنے لگے۔ خود والد صاحب بھی اس کام کے لئے کمر کَس کر تیار ہو گئے۔ انہوں نے والدہ صاحبہ سے بھی کہا کہ خواہ وہ اپنا سر و تالے کر ہی چلیں، لیکن آج موذی کو ڈھونڈ کر اسے ہلاک ضرور کرنا ہے۔ نانی اماں سے بولے: "آپ اسی جگہ تشریف رکھیں، مگر آپ کے ہاتھ میں بھی کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے موذی اس طرف پھر آئے اور آپ کے دستِ مُبارک ہی سے وہ اپنے انجام کو پہنچے۔"

والد صاحب، نانی اماں کو یہ ہدایت دے کر برابر والے کمرے کی طرف چلے ہی تھے کہ وہاں سے تڑاخ۔ دھپ۔ دھڑام۔ ٹھا... ٹھوں۔ مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ "بچو اب کہاں نکل کر بھاگے گا... آج تیرا خاتمہ کر کے چھوڑیں گے۔ تُو نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔" ٹوکیو، ہانگ کانگ اور شنگھائی موذی پر وار بھی کر رہے تھے اور اس طرح کے جُملے بھی ادا کر رہے تھے، لیکن انہی آوازوں کے ساتھ پوپل کے چلّانے کی آواز آئی۔ "ہائے مجھے مار ڈالا، ہائے میں مری۔" تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹوکیو کی ہاکی... ہانگ کانگ کا پایا اور شنگھائی کی لکڑی کے تمام وار یا تو زمین پر پڑے یا پھر پوپل کی ٹانگوں اور کمر پر، کیونکہ وہ سب سے آگے تھی اور اسی نے موذی کو دیکھا تھا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے سب کو تنبیہہ کی کہ وہ دیکھ کر حملہ کریں۔ اس کے بعد پوپل کی ٹانگوں اور کمر پر زمبک لگایا گیا۔ پوپل کا موڈ ٹھیک ہُوا، تو دوبارہ موذی کی تلاش شروع ہوئی۔ سب سے پہلے پوپل ہی سے پُوچھا گیا کہ اس نے موذی کو کہاں دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں آئی اور نیچے جُھک کر دیکھا، تو پھر چلّا اُٹھی۔ "بابا جان موذی اسی جگہ صندوق کے نیچے ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔" یہ سُنتے ہی ٹوکیو، ہانگ کانگ پھر چلّائے: "کہاں ہے کہاں ہے۔" لیکن والد صاحب نے انہیں چُپ رہنے کی ہدایت کی۔ کہنے لگے۔ "پہلے اچھی طرح دیکھ لو۔ کیا واقعی موذی صندوق کے نیچے چُھپا بیٹھا ہے؟" شنگھائی نے فوراً جُھک کر ایک لمحہ کو دیکھا اور اس نے خوش ہو کر بتایا کہ واقعی موذی صندوق کے نیچے دبکا بیٹھا ہے۔ والد صاحب بولے: "جس طرح میں کہتا ہوں، اسی طرح سب لوگ عمل کریں گے، تو موذی کو ہم یقیناً ہلاک کرنے

میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سُنو! ٹوکیو تم سب سے آگے اپنی ہاکی لے کر کھڑے ہو جاؤ جب میں حکم دوں اس وقت آہستگی کے ساتھ ہاکی کو صندوق کے برابر سے نیچے کی طرف چلانا، اس طرح موذی فوراً باہر نکل آئے گا۔ شنگھائی تم ٹوکیو کے پیچھے ڈیڑھ گز کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جیسے ہی موذی نکل کر تمہاری زد میں آئے، تم اس پر وار کرنا۔ ہانگ کانگ! تم بھی اس شنگھائی کے پیچھے دو گز کے فاصلے سے مستعد ہو کر ایستادہ رہو۔ میں خود یہاں دروازے پر موسل لے کر کھڑا ہوں۔" والدہ صاحبہ سے مخاطب ہو کر کہا: "دیکھو جی تم میرے پیچھے کھڑی ہو جاؤ، مگر یاد رہے سر و تا دیکھ کر چلانا کہیں موذی کے بجائے مجھے ہی ہلاک کر ڈالو۔"

والدہ صاحبہ بولیں "اے ہے خدا نہ کرے۔ میں آپ کی دشمن ہوں۔ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ اسکول میں میرا نشانہ سب سے اچھا ہوتا تھا۔"

ننھے پیکن سے کہا وہ غلیل چھوڑ کر کوئی اور چیز لے ورنہ ہو سکتا ہے اس دفعہ پھر موذی کے بجائے کسی اور کے غُلّہ لگ جائے۔ اس طرح سب کو ہدایات دینے کے بعد والد صاحب نے ٹوکیو سے کہا: "جیسے ہی میں وَن ٹو تھری کہوں تم صندوق کے نیچے ہاکی چلانا۔"

"میں بالکل تیار ہوں۔" ٹوکیو بولا۔

"اچھا بھئی سب لوگ تیار ہو جائیں۔"

"ہم سب تیار ہیں۔" نانی صاحبہ نے سلیم شاہی جوتی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"وَن . . . ٹو . . . تھری۔" ابھی والد صاحب نے پوری طرح تھری بھی نہیں کہا تھا کہ شنگھائی نے جلدی میں آ کر اپنے ہاتھ کی جلی ہوئی لکڑی اس زور سے چلائی کہ وہ ٹوکیو کی کمر میں جا کر لگی۔ ٹوکیو ہائے ہائے کرتا ہوا پہلے تو زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ہاکی لے کر شنگھائی پر وار کرنے ہی والا تھا کہ والد صاحب نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرایا۔ سب کا خیال تھا کہ اس ہنگامے کے باعث موذی صندوق کے نیچے سے کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہوگا، لیکن جیسے ہی والد صاحب نے جھک کر دیکھا کہنے لگے: "بھئی کمال ہے موذی ابھی تک وہیں دبکا بیٹھا ہے۔ میں جس طرح پہلے بتا چکا ہوں سب لوگ اسی طرح تیار ہو جائیں اور خبردار اگر کسی نے بے احتیاطی سے کوئی وار کیا۔"

"وَن... ٹو... یار ٹوکیو! کیا کمر سہلا رہے ہو۔ جوان آدمی کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہو۔ میرا مطلب ہے ڈٹ کر حملے کے لئے جُھک جاؤ۔"

"بہت اچھا جی۔" ٹوکیو نے کمر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"وَن... ٹو... تھری۔" موذی کو ٹوکیو کی ہاکی نے صندوق کے نیچے سے نکالا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ کی لکڑی اور پائے کی ضربیں کھانے کے بعد وہ گیند کی طرح اُچھل کر والد صاحب کے موسل کے نیچے آگیا۔ سب قبلہ گاہی کے اِردگرد جمع ہوگئے اور قبلہ گاہی ایک احساسِ فخر کے ساتھ موسل پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ آخر والدہ صاحبہ نے کہا: "کیا موذی کا کچومر ہی نکالو گے۔ وہ تو کبھی کا مر چکا ہوگا۔" والدہ صاحبہ کے اس کہنے پر والد صاحب نے موسل کو بزعمِ خود موذی کی گردن سے اُٹھایا اور اِردگرد جمع ہوئے افراد الگ ہوئے، تو سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ والد صاحب کے موسل کے نیچے موذی کے بجائے کپڑے کا بنا ہوا وہ چوہا نکلا جو نانی اماں نے بچوں کے اِصرار پر اس لئے تیار کیا تھا کہ اسے دیکھ کر موذی قریب آئے اور پکڑا جا سکے۔ والد صاحب نے بڑے زور کے ساتھ لاحول پڑھی اور نانی اماں کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد شریر ٹوکیو نے آکر پُوچھا: "کیوں جناب! اب کیسا حکم ہے؟"

"حکم کیا ہونا ہے، موذی کو تلاش کرو، آج اُسے پکڑے بغیر دم نہیں لیں گے۔" یہ سُن کر بچے پھر موذی کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ والدہ صاحبہ کہنے لگیں: "مَیں ذرا پان کھالوں پھر کوئی دوسری بات کروں گی۔" چنانچہ وہ اپنے پاندان کے پاس چلی گئیں۔ والد صاحب نانی اماں کے برابر بیٹھ رہے ــــ نانی اماں اپنی صندوقچی کو باندھنے میں مصروف تھیں۔ جس ڈوری سے اسے باندھ رہی تھیں وہ ذرا کم پڑ گئی، تو انہوں نے والد صاحب سے کہا: "میاں کوئی ڈوری تلاش کر کے دو۔" والد صاحب ابھی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ پھر خود ہی بولیں: "یہ تمہارے پاس پلنگ کے نیچے جو تھیلا رکھا ہوا ہے، اسی میں دیکھو شاید کوئی چھوٹا موٹا ٹکڑا مل جائے۔"

"مَیں اپنی عینک لے آؤں۔" یہ کہہ کر والد صاحب اُٹھنے کو ہوئے، تو نانی اماں نے پھر ٹوکا: "اے ہے میاں مجھے تو بغیر عینک ہی دُور سے اس میں سیاہ رنگ کی ڈوری

نظر آرہی ہے۔

"کہاں ؟" والد صاحب نے تھیلے کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"ایک طرف کونے میں وہ دیکھو کیا ڈوری کا سرا نکلا ہوا دکھائی نہیں دے رہا ہے ؟"

"جی ہاں کچھ ہے تو سہی۔"

"بس اسے کھینچ کر مجھے دے دو۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر والد صاحب نے جیسے ہی ڈوری کا وہ سرا اُوپر کی طرف کھینچا چیں چیں کرتا ہوا موذی باہر آگیا، لیکن بجائے اس کے کہ والد صاحب اُسے پکڑتے یا مارتے وہ والد صاحب کے انگوٹھے پر کاٹ کر بھاگ گیا۔ "موذی یہ رہا۔ موذی وہ رہا۔ موذی اِدھر گیا۔ موذی اُدھر گیا" کا ایک شور برپا ہو گیا، لیکن صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ موذی کس کمرے میں جا کر چھپا ہے۔ والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے کہا: "آخر جب وہ آپ کے ہاتھ میں آگیا تھا، تو پھر اُسے چھوڑا کیوں ؟"

"بھئی کیا بتاؤں، بس ایک دم گھبرا گیا۔"

"بڑی ہی شرم کی بات ہے۔ ایک معمولی سے جانور سے آپ ڈر گئے۔"

"اس میں شرمانے یا ڈرنے کی کیا بات ہے ؟"

"بس رہنے دیجئے۔ قسم خدا کی اگر میرے ہاتھ میں موذی آجاتا، تو میں اس کا وہیں قلع قمع کر دیتی۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آپ کے ساتھ ایسا ہوتا، تو محترمہ آپ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہوتیں۔"

"اب میاں بیوی لڑنے کیوں بیٹھ گئے، بچے ہنسیں گے۔ کچھ موذی کے بارے میں سوچو۔" نانی اماں نے موضوع کو بدلتے ہوئے والد صاحب اور والدہ صاحبہ سے کہا اور پھر والد صاحب کے انگوٹھے کی طرف دیکھ کر بولیں: "اے ہے غضب ہو گیا موذی کم بخت نے میرے بچے کو لہولہان کر دیا۔ کس طرح دھل دھل خون بہہ رہا ہے۔ بیٹی! دیکھ کیا رہی ہو جلدی سے اس پر پٹی باندھو۔" یہ سُن کر والدہ صاحبہ فوراً اُٹھیں اور پٹی کے لئے کپڑا لے کر آئیں۔ پٹی بندھ گئی، تو والد صاحب

پھر موذی کی تلاش میں کمر بستہ ہو گئے۔

برابر والے کمرے سے شور بلند ہوا۔ "وہ دیکھو وہ دیکھو موذی کی دُم نظر آ رہی ہے۔"

"ہاں ہاں مَیں دیکھ رہا ہوں۔" ٹوکیو نے جواب دیا۔

"تو پھر چُپکے سے اُسے پکڑ لو۔"

"ارے ٹوکیو دُم پکڑ کر فوراً موذی کو باہر کی طرف پھینک دینا کہیں میری طرح تمہارا انگوٹھا بھی زخمی نہ کر دے۔" والد صاحب چلائے۔ ٹوکیو نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے کر کے دُم کا سِرا پکڑا اور والد صاحب کی ہدایت کے مطابق موذی کو فوراً باہر کی طرف پھینک دیا۔ موذی کے بجائے نانی اماں کے سینے پر ایک موٹی سی سیاہ رنگ کی چھپکلی آ گر پڑی۔ نانی اماں ہائے ہائے اور ہے ہے کرتی ہوئی کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں "ٹوکیو! تمہیں چوہے کی دُم اور چھپکلی کی دُم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

والد صاحب نے اپنے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا: "اماں جان! مَیں بھی تو چوہے کی دُم اور ڈوری میں کوئی تمیز نہ کر سکا تھا۔ آخر یہ میرا ہی تو بیٹا ہے۔"

"اے میاں! اولاد کی اس طرح حمایت کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" ابھی نانی اماں اور والد صاحب میں گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ٹھا... ٹھوں... دھپ... کڑم... تڑاخ وغیرہ قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ والد صاحب نے پھر تنبیہہ کی کہ دیکھو موذی کو ضرور مارنا، لیکن اس طرح نہیں کہ اس کا کچومر ہی نکل جائے۔ مَیں اگر چوہے کا پیٹ پھٹا ہوا دیکھ لوں، تو ہفتوں کھانا نہیں کھا سکتا۔ موذی کو مارنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ اس کے سر پر ایک ہلکی سی چوٹ لگا دی جائے۔"

تشنگھائی بولا "ابو! آپ خواہ مخواہ درمیان میں بول پڑے۔ موذی بالکل ہماری زد میں تھا اور ہم اس کا خاتمہ کرنے ہی والے تھے۔"

دھپ... دھوں... دھڑک... ٹھا... دھم... برابر کے کمرے سے پھر آوازیں آنے لگیں۔ "وہ مارا۔" ٹوکیو اور ہانگ کانگ کا نعرہ بلند ہوا۔ موذی کو ٹھوکر سے گیند کی طرح اچھالتے ہوئے بچے کامن روم میں لے آئے۔ نانی اماں بولیں "دیکھو موا ہمارے گھر کی خوراک کھا کھا کر

کتنا پل گیا تھا۔ بلّی کا بچّہ معلوم ہوتا ہے۔"

والد صاحب نے کہا: "ٹوکیو بیٹا! اب اسے دُم سے پکڑ کر باہر پھینک آؤ۔"

"ابّو! دُم سے پکڑتے ہوئے مجھے گھن آتی ہے۔"

"اچھّا تو پھر آہستہ آہستہ ہاکی سے دھکیل کر اسے باہر پھینک آؤ۔ دیکھو ایسا نہ کرنا کہ اس کا خون نکل آئے۔"

ٹوکیو آگے تھا اور باقی بچّے پیچھے۔ اس نے والد صاحب کی ہدایت کے مطابق آہستگی سے موذی کو کمرے سے باہر دھکیلنا شروع کیا۔ جیسے ہی موذی صحن میں آکر پڑا، ابھی ٹوکیو اور دوسرے بچّے کامن رُوم ہی میں تھے کہ موذی اُٹھ کر بھاگ گیا۔ سب بچّوں نے شور مچایا "ارے موذی زندہ ہوگیا۔ موذی زندہ ہوگیا۔"

والدہ صاحبہ غصّے ہو کر والد صاحب کی طرف منہ کر کے بولیں: "سارا کام انہوں نے بگاڑا ہے۔ نہ یہ بچّوں سے احتیاط کے لئے کہتے نہ موذی اس طرح بچ کر نکلتا۔ آج تو سب گھر والوں کا اتوار کا دن غارت ہوگیا۔"

والد صاحب میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "لیکن میرے بیٹے کھٹمنڈو کا دِن بالکل غارت نہیں ہوا، اسے تو ایک مزے دار مزاحیہ مضمون ہاتھ آگیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔" مَیں نے اثبات میں سَر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور یُوں موذی کی ہلاکت کی مہم اس اتوار اپنے انجام کو پہنچی۔

والد صاحب نے کہا: "برخوردار! خوش ہونے سے پہلے یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ ہر موذی، چوہے کی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اُس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ جہاں ذرا سی غفلت ہوئی وہیں یہ سمجھو کہ موذی کے بجائے اُس سے نجات حاصل کرنے والوں کی خیر نہیں۔

شاگردِ رشید

دو تین روز سے متواتر موسم میں بلا کی تبدیلی آگئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور آسمان پر اُودی اُودی گھٹا قریب قریب ہر وقت موجود رہتی پہلے دو روز تو کچھ میں نے طلبہ کا کہا مانا اور کچھ اُن سے اپنی بات منوائی، لیکن تیسرے روز میرا مصمّم ارادہ تھا کہ آج ایک لمحے بھی کلاس میں ادھر اُدھر کی بات نہ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ غالب کی غزل پڑھنا بذاتِ خود یک گونہ تفریح کا عمل ہے۔ اگرچہ اِس تفریح میں ذرا دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ بہرحال میں بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ کلاس رُوم میں داخل ہوا۔ طلبہ نے آج بھی فائن ڈے، فائن ڈے کی رٹ لگانا شروع کردی۔ میں نے اُنہیں خاموش کراکے کہا: "سُنو! عزیزانِ مَن آج غالب پڑھاؤں گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کی کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں"۔ طلبہ نے جیسے ہی فائن ڈے، فائن ڈے دوبارہ کہا، میں نے اُنہیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ اِس کے باوجود ایک دو جگہ سے یہی آواز پھر آئی تو میری زبان سے بے ساختہ نِکلا۔ "اُلّو کے پٹھے"۔۔۔ کلاس میں ایک دَم سنّاٹا چھا گیا، لیکن میرے عین سامنے بیٹھے ہوئے طالب علم نے کھڑے ہوکر کہا: "سر! آپ ہمارے بزرگوں کو تو بُرا نہ کہیں"۔ اِس پر دوسرے لڑکوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں فوراً سمجھ گیا طلبہ کو اس گالی کے اصل معنی معلوم نہیں؛ چنانچہ اُسی کھڑے ہوئے لڑکے سے میں نے پُوچھا: "تمہیں معلوم ہے پٹھّا کِس کو کہتے ہیں؟"

"جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔"

"ارے جی جی کیا کررہے ہو۔ پٹھّا شاگرد کو کہتے ہیں۔" میری یہ تشریح سُنتے ہی وہ طالبعلم

بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "سر پھر کوئی بات نہیں"۔ اس پر دوسرے طلبہ بھی ہنس دیئے۔ میں سمجھا بات آئی گئی ہوئی، لیکن پچھلی قطار میں سے ایک طالب علم کھڑا ہو کر کہنے لگا "سر! میں اب بھی پُرزور احتجاج کرتا ہوں کہ آپ نے ناحق ہمارے اُستاد کو اُلو کہا ہے۔"

مَیں نے اُس طالب علم کو سمجھانے کے طور پر کہا: "ارے یار ایسا وہ کونسا خوش قسمت اُستاد ہے جس کے اُلو ہونے پر آپ کو اس قدر صدمہ پہنچا ہے۔"

"سر وہ میرے بہت چہیتے اُستاد ہیں۔"

"آخر وہ ہیں کون ذاتِ شریف، ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

"سر! آپ کو اُنہیں اُلو کہنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

"چلو بھئی مانتا ہوں مجھے اس طرح کا کوئی حق نہ تھا لیکن اُن محترم کا نام تو بتاؤ۔"

"سر! میرے وہ محترم اُستاد . . ."

"ہاں . . . ہاں بتاؤ . . . رُک کیوں گئے۔"

"سر! وہ بڑے اُستاد ہیں۔"

"پھر بھی اُن کا کوئی نام تو ہوگا۔"

"سر! اُن کا نام سیّد مشکور حسین یاد ہے۔"

"اچھا بچو یہ بات ہے، ہماری بلّی اور ہمیں ہی میاؤں"۔ میرا یہ فقرہ سُنکر وہ طالب علم ہنستے ہوئے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

میں، خواجہ اظہر اور پروفیسر صدیقی ایک شام مال پر ٹہل رہے تھے۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ آج کل اُستاد اور شاگرد کا رشتہ اتنا مضبوط نہیں رہا جتنا کہ اسے ہونا چاہیئے۔ اچھی خاصی بحث کے بعد ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ اگر اُستاد خلوص کے ساتھ خود بھی پڑھتا ہو اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھائے تو اس رشتے میں آج بھی وہی استحکام پیدا ہو سکتا ہے جس کی ضرورت ہے، البتہ اس میں شاگرد کے شوق اور جذبے کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں موجود ہوں، بلکہ آج بھی جہاں یہ دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں وہاں اُستاد اور شاگرد کا یہ رشتہ پوری طرح مستحکم ہوتا ہے۔

"لیکن اِس استحکام کا ہمارے پاس ثبوت کیا ہے"، صدیقی نے سوال اُٹھایا۔
خواجہ اظہر بولے "غالباً آپ یہ پُوچھنا چاہتے ہیں کہ اُستاد کو یہ کیسے معلوم ہو کہ اُن کا رشتہ اپنے شاگرد سے مضبوط بنیادوں پر قائم ہے؟"

"جی ہاں! میرا مطلب کچھ اسی طرح کا ہے۔ دیکھ لیجئے ہم تو بزعمِ خود نہایت خلوص سے پڑھاتے پڑھاتے مر گئے، لیکن ابھی تک کوئی بیّن ثبوت ہمارے ہاتھ نہیں لگا۔"

"مَیں سمجھتا ہوں اگر شاگرد کے دِل میں اُستاد کی کوئی ایک اچھی بات بھی بیٹھ جاتی ہے، یہ اُس استحکام کا بہت بڑا ثبوت ہے۔" اور پھر ڈاکٹر خواجہ اظہر مجھ سے مخاطب ہو کر پُوچھنے لگے:

"کیوں مشکور بھائی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں! مَیں بھی اپنے طور پر جو کچھ پڑھاتا ہوں خلوص کے ساتھ پڑھاتا ہوں، لیکن دِل میں یہ ہوس پھر بھی باقی رہتی ہے کہ اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے آئے۔" ہم یہ باتیں کرتے کراتے واپڈا ہاؤس تک پہنچ گئے۔ خواجہ اظہر اور صدیقی آگے نکل گئے اور میں اسی خیال میں غرق اُن سے پیچھے رہ گیا کہ واقعی ہمیں طلبہ کو پڑھاتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا، لیکن آج تک کسی طالب علم نے ہمارے پاس آ کر اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ ہماری کوئی بات اُس کی زندگی پر خصوصیت کے ساتھ اثر انداز ہوئی ہے یا ہماری زبان سے بھی کوئی فقرہ یا جملہ یا لفظ ایسا نکلا ہے جس نے ہمارے شاگرد کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہو۔ میرے دل میں ملال کی ایک ہلکی سی لہر سرایت کر گئی۔ میں نہایت آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک نہایت عُمدہ بڑی سی چمکیلی کار میرے برابر آ کر رُکی۔ کھٹ سے اُس کا دروازہ کھُلا اور ایک گورے چٹے رنگ کا خوبصورت نوجوان اُس میں سے باہر نکلا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "سر کیا آپ پروفیسر مشکور حسین یاد نہیں ہیں؟"

"ہاں بھائی مَیں مشکور حسین ہی ہوں"۔ میری زبان سے یہ الفاظ سُنتے ہی وہ نوجوان جُھک گیا اور اُس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ یہ کیا تکلّف کر رہے ہو۔
اُس نے مجھ سے پُوچھا، "سر کیا آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں؟"
مَیں نے اُسے اچھی طرح دیکھ کر جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کبھی میرے شاگرد

رہے ہیں۔"

"بالکل... بالکل... سر میں نے آپ سے پورے دو سال پڑھا ہے اور ایک خاص حوالے کے ساتھ آپ کا شاگرد ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"سر یاد کیجئے۔"

"بھئی اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا کہ آپ میرے شاگرد رہے ہیں۔"

"سر میں آپ کا شاگرد بھی ہوں اور اُلّو کا پٹھا بھی"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے برخوردار یہ کیا فضول بات کر رہے ہو۔"

"نہیں سر! آپ کو یاد نہیں آ رہا ایک دفعہ آپ نے خاص طور پر مجھے اُلّو کا پٹھا کہا تھا۔"

"صرف آپ کو۔"

"میرا مطلب ہے سر! آپ نے کہا تھا تمام کلاس کو لیکن تمام کلاس اُلّو کے پٹھے کا مطلب نہیں سمجھی تھی، مگر جب میں نے اعتراض کیا تو..."

"اچھا... اچھا... یاد آیا، مگر میاں وہ تو اُس زمانے کی بات تھی۔ وقت گیا، بات بھی گئی۔"

"نہیں سر! اس بات کو چھوڑیئے۔ میں تو آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔"

"اس بات کا احسان کہ میں نے آپ کو اُلّو کا پٹھا کہا تھا؟"

"سر! یہ واقعہ تو میں نے آپ کی خدمت میں ازراہِ مذاق اپنی یاد دلانے کے لئے عرض کیا ہے، ورنہ میرے دل میں آپ کی وہ قدر ہے جس کا زبانی اظہار ممکن نہیں۔"

"برخوردار یہ آپ کی سعادت مندی ہے، ورنہ آج کل شاگرد اپنے اُستاد کو کہاں یاد رکھتے ہیں۔"

"کیوں نہیں سر! اُستاد آپ ایسا ہو تو کون احسان فراموش شاگرد ہوگا جو یاد نہ رکھے گا۔"

"بہرحال میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ یہ آپ کی سعادت مندی ہے... اور سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"سَر! یونہی چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں۔"

"بھئی آخر اس کاروبار کی کوئی نوعیت بھی تو ہوگی؟" میرے اس سوال پر اُس نے گردن جھکا کر جواب دیا۔" بس سَر! یہاں پاکستان میں لوہے کی مختلف مشینیں بنانے کا ایک کارخانہ ہے، ایک کارخانہ کپڑے کا تنزانیہ میں لگوا کر پچھلے ہفتے ہی وطن لوٹا ہوں۔"

"خوب! یہ چھوٹا سا کاروبار ہے۔"

"سَر! حقیقت میں چھوٹا ہی سا ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے کارخانہ دار اور دولت مند پڑے ہیں۔ ہم تو مشکل سے پاکستان کے بڑے صنعت کاروں میں شمار ہو سکتے ہیں اور پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس طرح ہم بھی چھوٹے ہی ہوئے۔"

"ماشاءاللہ۔" مَیں نے داد کے طور پر کہا تو وہ دوبارہ جُھک کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔" اچھا سر! تو پھر اب اجازت دیجیے۔"

"ارے بھئی کہاں جا رہے ہو۔ آپ نے وہ بات تو بتائی ہی نہیں جس کی وجہ سے آپ مجھے کچھ زیادہ ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔"

"سر! اُس کے لئے تو آپ مجھے وقت دیجیے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ کبھی میرے ساتھ فرصت میں بیٹھ سکیں۔"

"آپ کا گھر تو گلبرگ میں ہوگا؟"

"جی ہاں۔"

"اور دفتر؟"

"وہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے دفتر کا پتہ بتایا تو اتفاق سے مجھے بھی ٹیوب ویل کے لئے ایک انجن خریدنا تھا۔ جس وقت مَیں نے اُسے یہ بات بتائی تو اُس نے اپنے چہرے پر کاروباری چمک لاتے ہوئے کہا؟" سَر! مجھے اُمید ہے کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اجازت لی اور کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اتنے میں صدیقی اور خواجہ اظہر بھی مجھے اپنے ساتھ لینے کے لئے واپس آ گئے۔ مَیں نے ان دونوں حضرات کو اپنے شاگرد کا واقعہ

سُنایا اور بڑے فخر سے گردن اُونچی کر کے کہا: "دوستو! ہمارے بھی کچھ ایسے شاگرد نکل آئے ہیں جو بڑے صنعت کار ہونے کے باوجود ہمیں باقاعدہ یاد رکھے ہوئے ہیں اور ہمارا بے حد احترام کرتے ہیں۔" اس پر دونوں دوستوں نے مجھ پر کچھ اس طرح نظر ڈالی جیسے میں بھی کوئی بڑا صنعت کار بن گیا ہوں۔

اگلے روز ہی وقتِ مقررّہ پر میں اپنے شاگرد کے دفتر پہنچ گیا۔ یہاں آ کر یاد آیا کہ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں۔ دفتر خاصا وسیع تھا اور اُس میں آدمی بھی بہت سے کام کر رہے تھے۔ آخر میں نے استقبالیہ کے کاؤنٹر پر جا کر پُوچھا: "مینجر صاحب کہاں بیٹھتے ہیں؟" مجھے اشارے سے مینجر کا پتہ بتا دیا گیا۔ مَیں دروازے پر پہنچا، تو چپڑاسی نے سوال کیا: "مینجر صاحب سے ملنا ہے؟" مَیں نے ہاں میں جواب دیا تو چپڑاسی کہنے لگا آپ اندر تشریف لے جا سکتے ہیں۔ اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحبِ ریش بزرگ تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ مجُھ سے ہاتھ ملایا اور پُوچھا: "فرمایئے کس لئے تشریف لائے ہیں؟" مَیں نے کہا: "مجُھے اُن صاحب سے ملنا ہے جو ابھی ایک ہفتہ ہوا تنزانیہ سے آئے ہیں۔" صاحبِ ریش بُزرگ بولے: "اچھا تو آپ کو چھوٹے صاحب سے مِلنا ہے۔"

مَیں نے پُوچھا: "اور بڑے صاحب کون ہیں؟"

"ظاہر ہے کہ وہ چھوٹے صاحب کے والد صاحب ہیں اِس کارخانے کے مالک۔"

اس کے بعد اُن بُزرگ نے اپنے چپڑاسی کو بُلا کر کہا: "اِن کو چھوٹے صاحب کے پاس لے جاؤ۔" چپڑاسی نے مجُھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی ہم چھوٹے صاحب کے دفتر کے قریب پہنچے میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے ہلکے نیلے شیشوں کے پیچھے نہایت تمکنت کے ساتھ میرا شاگرد ایک بڑی میز کے سامنے گھومنے والی کُرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مَیں اندر جانے لگا تو میرے ساتھ آنے والے چپڑاسی نے پُوچھا: "سَر آپ نے پہلے سے وقت لے رکھا ہے نا؟"

"ہاں بھئی کل ہی تمہارے چھوٹے صاحب کی مجُھ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا تو ذرا آپ یہاں ٹھہریں۔"

"کیوں؟"

"میں اُن کے چپڑاسی سے کہے دیتا ہوں کہ وہ صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع پہنچا دے۔"

اسی دوران میں میں نے دیکھا کہ میرے اُس شاگرد نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ دیکھتے ہی وہ فوراً اُٹھ کر دفتر سے باہر مجھے خود لینے آئے گا، لیکن میری یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ میں نے سوچا اُس نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔ بہرحال میں باہر ٹھہر گیا۔ چپڑاسی اندر اطلاع دینے گیا اور فوراً ہی واپس آگیا۔ میں اندر جانے لگا تو اُس نے مجھے روک لیا: "سر! میں نے چھوٹے صاحب کو آپ کی اطلاع دے دی ہے۔ آپ ذرا یہیں ٹھہریں۔"

"کیا چھوٹے صاحب کے پاس پہلے سے کوئی آدمی موجود ہے؟"

"آدمی تو کوئی نہیں۔"

"پھر؟"

"سر وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ آپ کو ابھی بلائیں گے۔" مجھے چپڑاسی کے اس جواب پر خاصا غصہ آیا اور اس سے بھی زیادہ مجھے اس بات پر غصہ آیا کہ میں شیشوں میں سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ میرا شاگرد مسکرا مسکرا کر سگریٹ کے دھوئیں چھوڑ رہا ہے اور کرسی پر بیٹھا بیٹھا ہل بھی رہا ہے۔ میں نے دو تین منٹ انتظار کیا۔ میں بغیر ملاقات کئے واپس جانے ہی والا تھا کہ گھنٹی بجی اور چپڑاسی نے مجھ سے کہا: "سر آپ اندر تشریف لے جا سکتے ہیں۔" میں اندر گیا تو میرے شاگرد صاحب مجھ سے کھڑے ہو کر ملے اور ساتھ ہی ساتھ معذرت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "سر! میں آپ کا پکا شاگرد ہوں۔ آپ بھی اگر پانچ منٹ دیر ہو جاتی تھی، تو ہمیں کلاس روم میں داخل نہ ہونے دیتے تھے۔ آج آپ بھی پانچ منٹ تاخیر سے تشریف لائے۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ آپ کو واپس لوٹا دوں اور کل کے لئے وقت دوں پھر خیال آیا کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ بہرحال میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے اپنا یعنی آپ کا اُصول توڑ دیا اور آپ کو آج ہی اندر بُلا لیا؛ ورنہ عام حالات میں میں کسی آدمی سے خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اگر پانچ منٹ سے زیادہ لیٹ ہوتا ہے تو پھر اُس سے اُس دن ملاقات نہیں کرتا اور ہاں! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ارے برخوردار! خدمت بھی ہو جائے گی اور سُناؤ کیا حال چال ہے۔ کیسے ہو؟"

"سر! میں بالکل اچھا ہوں۔ آپ یہ فرمائیے آپ کو کون سا انجن چاہیئے اور کتنی پاور کا۔"

"میں نے کہا ناکہ ابھی بتاتا ہوں، ذرا سانس تو لینے دو۔"

"سر! آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں؟"

"ہاں ہاں ضرور کہو۔"

"سر! میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے، کام کی بات کریں۔ کتنی پاور کا انجن درکار ہے۔"

میں نے اُسے مطلوبہ انجن کے بارے میں بتایا۔ اُس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ چپڑاسی اندر آیا تو اُسے نہایت تحکمانہ انداز میں کہا "صاحب کو خزانچی کے پاس لے جاؤ۔ یہ رقم داخل کر دیں تو انہیں پھر میرے پاس لے آنا۔"

"مگر برخوردار! کتنی رقم؟" اُس نے رقم بتائی تو میں اُس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

"عزیزم! اِس رقم میں تو مجھے تمہاری سفارش کے بغیر بھی انجن مل رہا تھا۔"

"سر! میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں نے والدِ محترم سے بات کی تھی۔ انہوں نے پوچھا "تمہارے یہ اُستاد کس قسم کے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بڑے بااُصول اور ایمان دار آدمی ہیں۔ اِس پر والد صاحب نے جواب دیا کہ پھر ایسے اُستاد کے لئے کسی طرح کی رعایت کرنا حماقت ہے۔ بااُصول آدمی رعایت کا نہ قائل ہوتا ہے نہ اُس کے قابل۔"

میں انجن کی رقم داخل کر کے واپس اپنے شاگرد کے پاس آیا تو وہ پھر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

"سر! میرے دِل میں آپ کی اتنی زیادہ قدر ہے کہ میں اُس کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتا۔ کبھی وقت مِلا تو ضرور بتاؤں گا کہ آپ کی ایک نصیحت نے مجھے کتنا فائدہ پہنچایا۔ حق تو یہ ہے کہ اس کے لئے میں آپ کا جتنا بھی شکر گزار ہوں اتنا کم ہے۔"

"عزیزم سچ پوچھو تو میں وہی بات سُننے کے لئے آج یہاں آیا تھا ورنہ انجن تو مجھے ویسے بھی مِل جاتا۔"

"سر! آپ نے بالکل دُرست فرمایا، لیکن کسی کا احسان ماننا یا شکریہ ادا کرنا ایک طرح باتیں بنانے کے مترادف ہے اور میں سمجھتا ہوں اس طرح کی باتیں بنانا ہم کاروباری لوگوں کے لئے بڑا مشکل کام ہے اور بڑی عیاشی بھی جس کے لئے ہمیں بہت ہی کم وقت میسر آتا ہے۔

پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ کسی فرصت کے وقت کم از کم آپ کو یہ ضرور بتاؤں کہ آپ کی ایک نصیحت نے میری اس کاروباری زندگی کو کس قدر پُر بہار بنا دیا ہے۔"

مَیں اُس دن عجیب ملے جُلے جذبات وخیالات لیئے ہوئے اپنے اُس شاگرد کے پاس سے واپس گھر آیا۔ جہاں مجُھے اُس کے کاروباری رویّے پر غُصّہ آ رہا تھا وہاں میرے دل میں یہ خواہش بھی سَر اُٹھا رہی تھی کہ اُس سے وہ نصیحت ضروری معلوم کرنا چاہیئے جس نے اُس کی زندگی کو پُر بہار بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مجُھے یہ خیال بھی بُری طرح کچوکے لگا رہا تھا کہ انسان بھی اپنی تعریف سُننے کے معاملے میں کس قدر کمزور اور حریص واقع ہوا ہے۔ بہر حال مجُھے اپنے اس شاگرد کا خیال کئی دن تک آتا رہا اور پھر وہ میرے ذہن سے اُتر بھی گیا۔

ایک دن جب حسبِ معمول مَیں اور صدیقی شام کو مال پر چہل قدمی کر رہے تھے اور ہمارا ارادہ جناح باغ پہنچنے کا تھا کہ آرٹس کونسل کے قریب پھر ایک بڑی چمکیلی سی کار ہمارے پاس آکر رُکی اور اُس میں سے میرا وہی شاگرد باہر نکل کر آیا۔ اُس نے اُسی عقیدت کے ساتھ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ مَیں نے اُس کا تعارف صدیقی سے کرایا۔ وہ صدیقی سے بھی جُھک کر ملا۔ میں نے اُسے صدیقی کے بارے میں بتایا کہ یہ بھی ہمارے کالج کے اُن اساتذہ میں سے ایک ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ اس پر میرے اس شاگرد نے صدیقی سے کہا: "سَر! مجُھے یقین نہیں ہے کہ آپ بہت اچھا پڑھاتے ہوں گے، لیکن معاف کیجئے (میری طرف اشارہ کرکے) سَر والی بات بہت کم اساتذہ میں ہوتی ہے۔ یہ تو اپنے طلبہ کو زندگی کے ایسے ایسے گُر بتاتے ہیں کہ اگر وہ یعنی طلبہ ان گُروں کو اپنے پلّے سے باندھ لیں تو اُن کی زندگی سنور جائے۔ میں تو ایک نالائق طالب علم تھا اور کلاس میں بیٹھ کر غور سے لیکچر نہیں سُنتا تھا؛ ورنہ مجھے بھی بہت حاصل ہو جاتا بس ایک دن ہی میں نے غور کے ساتھ سَر کا لیکچر سُنا اور اُسی دن کی بات نے میری زندگی کو چار چاند لگا ڈالے۔"

صدیقی نے بڑے اشتیاق سے پُوچھا: "بھئی ہمیں بھی تو بتایئے وہ کونسی بات ہے؟"

"سَر! کیا عرض کروں اِن سَر نے کہا تھا کہ اے طالب علمو! اگر تم چاہتے ہو کہ خوبصورت سے خوبصورت اور اچھی سے اچھی لڑکیاں تمہارے اِردگرد پھرتی رہیں تو اُس کے لئے ایک ہی گُر ہے

اور وہ یہ کہ تم کسی لڑکی کو بھی کوئی لفٹ نہ دو۔ اُس سے بات کرو لیکن بڑی بے نیازی اور لاغرضی کے ساتھ۔ اِس طرح تم جس قدر لڑکی سے اجتناب کرو گے اتنی زیادہ وہ لڑکی تمہاری طرف کھنچتی چلی آئے گی۔ بس سر! اُس دن مَیں نے اپنے اِن سر کی اتنی ہی بات سُنی اور اُسے گرہ سے باندھ لیا۔ باقی لیکچر بھی سر نے دیا اور اُس میں بہت سی باتیں سر نے بتائی ہونگی۔ لیکن مَیں نے اور کچھ نہیں سُنا... اور... سر!... اور... سر! میں کیا عرض کروں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اِس وقت میرے پیچھے پندرہ بیس نہایت خوبصورت لڑکیاں پھر رہی ہیں۔"

اتنا کہہ کر میرے اُس شاگرد نے ہم سے اجازت لی اور کار میں یہ کہتے ہوئے بیٹھ کر چلا گیا کہ "معاف کیجئے سر مَیں کچھ دیر اور آپ صاحبان کی صحبت میں رہتا، لیکن کیا کروں۔ کچھ لڑکیاں پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو وہ مجھے یہیں آ لیں۔"

مَیں نے صدیقی کی طرف داد یا بے داد طلب نگاہوں سے دیکھا اور صدیقی نے مجھے داد یا بے داد دیتے ہوئے کہا۔ "یار! مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوجوان تمہارا واقعی پکّا شاگرد ہے جسے عرفِ عام میں شاگردِ رشید کہتے ہیں۔ کیا سمجھے" مَیں نے کہا "بہت کچھ سمجھ گیا ہوں۔ شکریہ۔"

تو جہاں کہیں بھی جائے

مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ریح کا درد ہوتا ہے، مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ درد کبھی کبھی نہیں؛ بلکہ اکثر ہوتا ہے، لیکن اس حقیقت کے باوجود مَیں اپنے آپ کو ریح کے درد کا مریض کہنے یا کہلانے کے لئے تیار نہیں۔ مریض کے لفظ کے ساتھ ذہن میں جو تصویر اُبھرتی ہے، میری حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ ایک دفعہ تو یہ ریح کا دَرد اِس زور سے اُٹھا کہ میری جان نکلنے کو ہو گئی، لیکن اس صورت میں بھی مَیں نے اپنے آپ کو مریض تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے، خدانخواستہ مجھے قولنج کا درد ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا، اپنڈکس کا دَرد ہے، لیکن مَیں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یارو مجھے اِس قسم کا کوئی درد نہیں، بس ریح کا دَرد ہے۔ گھر والے جواب دیتے :
"اگر یہ ایسا ہی معمولی دَرد ہے تو آسمان سَر پر کیوں اُٹھا رکھا ہے، چپ چاپ پڑے رہو!" مَیں ذرا کی ذرا چُپ ہوتا، لیکن جیسے ہی یہ درد زور لگاتا میری آنکھیں باہر نکلنے کو ہو جاتیں اور اس کے نتیجے میں میرے مُنہ سے پھر چیخیں برآمد ہونے لگتیں، خود کو مریض اس لئے محسوس نہیں کر رہا تھا کہ درد کے دَوران میں مجھے بھُوک بھی خوب لگ رہی تھی۔ میرا دل دوستوں کے ساتھ کھیلنے کُودنے کو بھی چاہ رہا تھا۔ میرے کپڑے صاف نہ تھے، اُنہیں بدلنے کی خواہش بھی میرے مَن میں چُٹکیاں لے رہی تھی۔ گھر میں دو خوبصورت "گلاب" آئے ہوئے تھے انہیں دیکھنے اور اُن سے باتیں کرنے کے لئے بھی مَیں بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا، بلکہ جس وقت شدید دَرد اُٹھتا تھا تو اُن پری جمالوں پر نظر پڑتے ہی زندہ رہنے کی آرزو میں بھی کچھ زیادہ ہی شدّت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ درد ٹھہر ٹھہر کر اُٹھتا تھا اور مجھے صاف محسوس ہوتا تھا کہ جس وقت درد تھم جاتا ہے اُس

وقت ریح اپنا رُخ بدل لیتی ہے اور جیسے ہی وہ دوبارہ اپنے اصل رُخ پر آتی ہے، درد صاحب پھر جاگ اُٹھتے ہیں۔ یقیناً ریح کے راستے میں کوئی چیز حائل ہوگئی ہے، یہ سامنے سے ہٹے گی تو درد بھی بھاگ جائے گا۔ آخر یہ چیز سامنے سے کیوں نہیں ہٹتی یا ریح زور لگا کر آگے کیوں نہیں نکل جاتی۔ اتنی سی بات ہے لیکن یہ اتنی سی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ریح کو فرار ہونے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔" دھت تیری کی ایسی تیسی"۔ میں یہ کہہ کر پلنگ سے اُٹھا اور ایک زوردار زقند لگائی، لیکن زقند کے ساتھ ہی میری چیخ بھی نکلی۔ دادی اماں بولیں: "میں نہ کہتی تھی مشکور کے سر پر کوئی جن سوار ہوگیا ہے۔ کسی عامل سیانے کو بلواؤ۔ دو جوتے لگیں گے تو ابھی برخوردار کی حالت ٹھیک ہو جائے گی"۔

میں نے کہا: "کیا فضول بات ہے! مجھ پر کوئی جن سوار نہیں۔ میں تو خود اس وقت ایک طرح کا جن بن گیا ہوں"۔

دادی اماں فوراً چلائیں: "دیکھا دیکھا جن اسی طرح بولا کرتا ہے"۔ اور ساتھ ہی مجھے جوتا دکھا کر کہنے لگیں: "ارے کم بخت تجھے شرم نہیں آتی، سید زادے کو پریشان کر رہا ہے۔ اچھا، اتنے میں کوئی سیانا آتا ہے، میں خود ہی تیرا علاج کرتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ صحن میں سے بڑی جھاڑو اُٹھا لائیں اور آتے ہی بلا توقف موصوفہ نے مجھے اُس سے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "خدا کے لئے دادی اماں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں"۔

بڑے فاتحانہ انداز میں بولیں: "کوئی بہت ہی معمولی جن معلوم ہوتے ہو، وعدہ کرو کہ پھر کبھی یہاں نہ آؤ گے"۔ میں سوچ رہا تھا۔ دادی اماں کی ان باتوں کا کیا جواب دوں۔ جواب میں تاخیر ہوئی تو دادی اماں نے میرا کان زور سے پکڑ کر کہا: "جواب دیتا ہے یا تیرا کوئی دوسرا علاج کروں؟" درد چونکہ اس وقت ٹھہرا ہوا تھا، مجھے غصہ آگیا: "جائیے، نہیں جواب دیتا"۔

"اچھا! تیری یہ جرأت"۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی دادی اماں نے اپنے دائیں پاؤں کی جوتی دوبارہ نکالی اور میری ناک کے قریب لا کر کہنے لگیں: "لے اسے اچھی طرح سونگھ"۔

"لاحول ولا قوۃ! دادی اماں آپ مجھ سے یہ کیا مذاق کر رہی ہیں"۔

"او جن کے بچے، تو مجھے بار بار دادی اماں کیوں کہہ رہا ہے۔ میں تیری دادی کیوں ہوئی؟"

"دادی نہیں ہو تو اور کیا ہو؟"

"خدا نہ کرے کہ میں کسی جن کی دادی ہوں۔"

"وہ تو ہو۔"

"او جن، ابنِ جن، ابنِ جن! تو ہمارے گھر سے نکل جا ورنہ میں بھی سیدزادی ہوں، تیرا بہت بُرا حال کروں گی۔" اسی اثنا میں اتفاق سے ریح کو اپنا راستہ مل گیا اور میں چشم زدن میں بھلا چنگا ہو گیا۔ سب گھر والے خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ دادی اماں کو مفت میں داد مل رہی تھی۔ اس نہایت پرائیویٹ قسم کے واقعہ کو سُنانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ریح مجھے ہزار پریشان کرتی ہے لیکن میں اپنے آپ کو مریض نہیں کہہ سکتا؛ البتہ جس طرح مزاحیہ مضمون، مزاحیہ فلم، مزاحیہ صورتحال، مزاحیہ کردار وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہو سکتی ہے، تو مجھے بھی ایک مزاحیہ مریض کہا جا سکتا ہے۔ مزاحیہ مریض کہنے سے ایک تو مریض کے معنی کے ساتھ جو نہایت سنجیدہ اور افسردہ قسم کا تصور وابستہ ہے وہ دُور ہو جائے گا، دوسرے مزاحیہ کے لفظ کی موجودگی بذاتِ خود صورتِ حال کو خوشگوار بنا دے گی۔

ہاں، تو میں ریح کا ایک مزاحیہ مریض ہوں۔ ریح کے معنی تو آپ جانتے ہی ہوں گے، ہَوا یا عرفِ عام میں باؤ۔ باؤ کے مریض کو ادرک بہت مفید ہے۔ میں ادرک شوق سے کھاتا ہوں۔ چاول اور ماش کی دال نقصان پہنچاتی ہے۔ میں یہ دونوں چیزیں کم کھاتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ پرہیز بتایا جاتا ہے، اُس پر بھی عمل کرتا ہوں، لیکن اس تمام احتیاط کے باوجود ریح مجھے پریشان کیے بغیر نہیں رہتی۔ ریح مجھ سے مذاق کرتی ہے یا میں ریح سے۔ اِس ضمن میں یہ عرض ہے کہ میں ریح کے ساتھ کس طرح مذاق کر سکتا ہوں۔ ریح البتہ مجھ سے ضرور مذاق کرتی ہے۔ مذاق نہ کرتی، تو میں چشم زدن میں ٹھیک کیسے ہو جایا کرتا۔ کبھی کبھی تو خیال آتا ہے ریح کا فرشتہ مجھ میں حلول کر جاتا ہے اور اگر ریح کا کوئی جن بھی ہو سکتا ہے تو پھر دادی اماں کا خیال سو فیصد درُست ہے، لیکن جن کے بارے میں وثوق کے ساتھ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کوئی جن کتنا بھی شریف الطبع کیوں نہ ہو، اتنی آسانی سے میرے سر سے نہیں اُتر سکتا جس طرح کہ ریح کا فرشتہ آنِ واحد میں مجھے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ جن کی ذات

نہ اس قدر لطیف ہو سکتی ہے نہ اس قدر خوش مذاق کہ، مثال کے طور پر، وہ میری ناک میں آ جائے یا مجھ پر سوار ہو کر محض میرے جسم میں چند گدگدیاں کر کے بھاگ جائے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

میرا خیال تھا کہ ریح کا تعلق ایک فردِ بشر کی انتڑیوں سے ہوتا ہے، یعنی ریح ایک آدمی کی آنتوں ہی میں سفر کرتی ہے اور وہیں گھوم پھر کر اپنے قدرتی راستے سے باہر نکل جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر ریح کے باعث اگر کوئی تکلیف ہو سکتی ہے تو وہ انسان کے پیٹ میں ہو گی؛ چنانچہ۔ مجھے جب بھی پیٹ میں اس طرح کی تکلیف ہوئی، میں نے ریح کو بھگانے کی کوئی صورت نکالی اور وہ تکلیف رفع ہو گئی، لیکن ایک دن کا ذکر ہے میں آرام سے بیٹھا دادی اماں کے پاؤں دبا رہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کی سُرعت کے ساتھ ریح میرے پیٹ میں سے چل کر میری ناک کی نوک یعنی پھنگل پر آ کر رک گئی ہے۔ اس کے رُکتے ہی میری ناک کی نوک میں اس زور کی چبھن ہوئی کہ میں چلائے بغیر نہ رہ سکا۔ دادی اماں نے پُوچھا: "اے لڑکے، تجھے بیٹھے بٹھائے یک لخت یہ کیا ہو گیا؟"

"دادی اماں، جن میری ناک میں گھُس آیا ہے۔"

"ناک میں؟"

"جی ہاں ناک میں بھی کیا، یوں کہیے ناک کی نوک میں"۔ میری یہ بات سُنتے ہی دادی اماں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً میری ناک پکڑ لی اور اس زور سے پکڑی کہ میری آنکھوں میں آنسو آئے بغیر نہ رہ سکے۔ اِدھر دادی اماں نے میری ناک چھوڑی اُدھر مجھے ایک ڈکار آئی اور اس کے ساتھ ہی ناک کا درد یعنی ریح کا درد غائب ہو گیا۔ دادی اماں خوش تھیں کہ انہوں نے جن کو بھگا دیا۔ میں نے سمجھا یہ اتفاق کی بات ہے کہ جیسے ہی دادی اماں نے میری ناک چھوڑی اُسی وقت مجھے ڈکار آ گئی؛ ورنہ ڈکار کا ناک سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دادی اماں کے ناک پکڑنے اور چھوڑنے کے عمل کے دوران میں مجھے یوں لگا تھا جیسے دادی اماں نے ریح کو پکڑ لیا اور بعد میں اُسے جب چھوڑا ہے تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پہلے میرے پیٹ میں واپس گئی اور پھر وہاں سے حلق کے راستے باہر

نکل گئی۔

آپ اسے شاید بالکل انوکھی بات کہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ریح کا درد میرے پیٹ میں بہت ہی کم اُٹھتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ پیٹ میں تو صرف ایک دو بار ہی اُٹھا ہے، ورنہ اِس کی اصل آماجگاہ تو میرے جسم کے دوسرے حصے ہیں۔ پیٹ میں ہوتا بھی ہے تو اس طرح جیسے ریح گدگدیاں کر رہی ہے یا زیادہ سے زیادہ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ جس چیز کو ریح کا درد کہتے ہیں، وہ اور ہی مقامات میں ہوتا ہے اور مواقع بھی بعض وقت ایسے ہوتے ہیں کہ مجھے نہ صرف ریح کے درد سے تکلیف پہنچتی ہے، بلکہ شدید ندامت بھی اُٹھانی پڑتی ہے۔ مثلاً ایک دفعہ مَیں ایک جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔ تقریر اپنے نقطۂ عروج پر تھی کہ اچانک میری شہادت کی اُنگلی میں ریح کا درد اُٹھا۔ مَیں نے فوراً تقریر بند کر دی اور اپنی اُنگلی کو مسلسل ہلانا شروع کر دیا۔ منتظمین جلسہ میں سے کسی نے سمجھا کہ مَیں اُسے اپنے پاس بُلا رہا ہوں۔ وہ غریب دوڑا ہوا میرے پاس آیا۔ ایک دوسرے منتظم نے خیال کیا مَیں پانی مانگ رہا ہوں؛ چنانچہ وہ پانی کا گلاس لے کر لپکا۔ حاضرینِ جلسہ میں سے میرے ایک دوست نے سوچا شاید مَیں اُسے بلا رہا ہوں، کیونکہ جس پرچے پر مَیں نے تقریر کے اشارے لکھے تھے وہ اس کی جیب میں رہ گیا تھا؛ لہٰذا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھاگا۔ غرض اُس وقت میرے ریح کے درد نے پورے جلسے کو خاصا حیران اور پریشان کر ڈالا۔

ایک اور موقع کا ذکر ہے، مَیں خاصی ثقہ قسم کی محفل میں بیٹھا تھا۔ ایک نہایت سنجیدہ موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ جیسے ہی بحث کا رُخ میری طرف ہوا، تمام حاضرینِ محفل نے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ عین اُسی وقت میرے دائیں کولہے میں ریح کا درد اُٹھا۔ درد کو دبانے کے لئے مَیں اُس طرف کو جُھکا تو درد برقی رو کی طرح میرے بائیں کولہے میں آگیا۔ اب مَیں دائیں کے بجائے بائیں جانب جھک گیا، لیکن درد کو نہ جانے کیا مذاق سُوجھ رہا تھا وہ بائیں سے پھر دائیں میں آگیا۔ غرض اس طرح درد اِدھر اُدھر دوڑیں لگاتا رہا اور ساتھ ہی مجھے بھی کُرسی پر بے چین کرتا رہا۔ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے احساس دلاتے ہوئے کہا: "مشکور صاحب، آپ بیٹھے بیٹھے کُود کیوں رہے ہیں؟ خدا کے لئے کوئی بات کیجئے۔

سب لوگ آپ کے منتظر ہیں۔"

قصہ دراصل یہ ہے کہ ریح کے درد کی مختلف صورتیں ہیں۔ اُن میں سے نمایاں یہ دو تین کہی جا سکتی ہیں۔ ریح کا درد بشکلِ خارش، ریح کا درد بشکلِ خلش یعنی چبھن اور ریح کا درد بشکلِ گدگدی (ازبان دان حضرات معاف فرمائیں مجھے گدگدی کی فارسی نہیں آتی اس لئے اضافت کے ساتھ یہی لفظ یہاں رکھ دیا گیا ہے) ریح کا درد بشکلِ خارش کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ چند عزیز خواتین ایک جگہ تشریف فرما تھیں، مَیں بھی اُن میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت مزے دار اور دلچسپ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی اطلاع کے بغیر ریح کا درد بشکلِ خارش میرے حلق میں تشریف لے آیا۔ عجیب اُلجھن ہوئی، کچھ دیر تو میں اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا، یعنی سوچتا رہا کہ کسی طرح مَیں یہ بھول جاؤں کہ ریح کا درد میرے حلق میں خارش کر رہا ہے، مگر ہزار کوشش کے باوجود میں اسے بھلانے میں کامیاب نہ ہو سکا، بلکہ اس کے برعکس یہی بھول گیا، میں کہاں بیٹھا ہوں اور حسبِ معمول اس درد کو رفع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے حلق میں کھجلی ہوتی ہے تو اُسے میں اپنی اُنگلی کے ذریعے خارش کر کے رفع نہیں کرتا، کیونکہ ایک دفعہ مَیں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی تو کام بگڑ گیا تھا؛ لہٰذا اس کے لئے مَیں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ مَیں اس طرح آوازیں نکالنا شروع کرتا ہوں جس سے حلق کی دیواروں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے؛ چنانچہ اُس وقت بھی مَیں نے یہی عمل کیا۔ "خی خی — خاخا" خُوخُو — خُو — خی — خا — مَیں نہایت بے تکلفی سے "خی خی خاخا" کرنے میں مصروف تھا کہ خواتین میں سے ایک صاحبہ نے میرے سامنے نہایت مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو کر دریافت فرمایا: "مشکور صاحب! کیا مَیں یہ پُوچھنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ آپ اِس وقت کون سی بولی بول رہے ہیں؟ بلی کی یا شیر کی؟"

مَیں نے گھبرا کر اپنی خی خی خا خا کو "ہُوں ہُوں، ہاں ہاں" میں تبدیل کرتے ہوئے جواب دیا: "کیا مطلب؟" اور ساتھ ہی ہلکی سی ڈکار لی جس کے نتیجے میں وقتی طور پر ریح کا درد رفع ہو گیا۔ وقتی طور پر مَیں نے اس لئے کہا کہ یہ مسخرہ حلق سے نکل کر میری بغلوں میں آ گیا اور وہاں گدگدیاں کرنے لگا۔ مَیں چونکہ اُس وقت بغلیں بجانے یعنی خوش ہونے کے موڈ میں نہیں تھا، اس لئے

اس کی یہ حرکت بھی کچھ اچھی نہ لگی۔ بظاہر ریح کے درد کا حلق میں بشکلِ خارش آنا خاصا عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عدد ڈکاریں تبدیل ہو جائے، مگر میرے ساتھ ہوتا یہی کچھ ہے۔ حلق میں خارش ہوئی تو پہلے دو چار منٹ 'خی خا' کی اور پھر ایک دم سے ڈکار۔ درد یہ جا وہ جا، مگر کبھی "خی خا" طول بھی کھینچ لیتی ہے۔ ایسے میں مجھے خاصا جز بز ہونا پڑتا ہے۔

سائیکل یا موٹر سائیکل پر چلا جا رہا ہوں کہ اچانک دائیں آنکھ کے پپوٹے میں ریح کا درد سوئیاں سی چبھونے لگا۔ اب ایسے عالم میں یا تو جس سواری پر سوار ہوں اُسے ٹھہرا کر اتر جاؤں اور پھر آنکھ پر ہتھیلی رکھوں اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو لازم ہے کہ اُس آنکھ کو زور زور سے بند کروں۔ آپ جانتے ہیں ایک آنکھ کا بند کرنا ہمارے معاشرے میں بدمعاش ہونے کی واضح دلیل ہے؛ چنانچہ مجھے اکثر اوقات واضح طور پر بدمعاش بننا پڑتا ہے، کیونکہ میرے ساتھ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جلدی کالج پہنچنا ہے، لیکن عین بھیڑ میں ریح کے درد صاحب میری کسی آنکھ کے پپوٹے میں گھس آئے۔ اب ایسی صورت میں میرے پاس صرف یہی علاج رہ جاتا ہے کہ میں اُس آنکھ کو زور زور سے جلدی جلدی بند کروں اور کھولوں، یعنی عُرفِ عام میں مسلسل آنکھ مارنے میں مصروف ہو جاؤں۔ شکر ہے ابھی تک کسی خاتون کے سامنے اس طرح میری آنکھ میں درد نہیں اُٹھا، مگر ایسا اکثر ہوا ہے کہ سائیکل یا موٹر سائیکل پر بیٹھا ریح کے درد کو رفع کرنے کے لئے آنکھ مارتا ہوا چلا جا رہا ہوں اور لوگ سمجھ رہے ہیں، کوئی کامیڈین ہوں یا مجھے کامیڈین بننے کا شوق ہے اور اسی شوق کے تحت طرح طرح کے منہ بنانے کی مشق کر رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم بائیں آنکھ تو آسانی سے بند کر سکتے ہیں، لیکن دائیں آنکھ بند کرنے کے لئے مُنہ کو خاصا ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے، یا ممکن ہے آپ کو اتنی مشق ہو کہ جس آنکھ کو چاہیں بند کر لیں، جس کو چاہیں کھُلی رکھیں، لیکن مَیں کم از کم ایسا نہیں کر سکتا۔ مَیں دائیں کو کھُلا رکھ کر بائیں تو آسانی سے بند کر سکتا ہوں، لیکن بائیں کو کھُلا رکھ کر دائیں کو آسانی سے بند نہیں کر سکتا۔ اِدھر ریح کے درد کا یہ حال ہے کہ جس آنکھ میں چاہے وقت بے وقت نازل ہو جاتا ہے؛ چنانچہ اپنا اُلٹا سیدھا منہ بنانا مسلم سمجھئے۔

صُبح کا وقت تھا، میَں شیو بنا کر اور نہا دھو کر اپنے کمرے میں ناشتے کا انتظار کر رہا تھا کہ آنکھ جھپکتے ہی ریح کا درد پیٹ سے چل کر میرے بائیں کان کی کنپٹی میں آ کر کرنٹ مارنے لگا۔ میَں نے اپنا یہ کان کھینچا تو درد صاحب وہاں سے بھاگنے کے بجائے دوسری کنپٹی میں آموجود ہوئے، آخر مجھے اپنے دونوں کان پکڑنے پڑے، میرا مطلب ہے کھینچنے پڑے۔ آہستہ آہستہ کھینچے تو کوئی خاص افاقہ نہ ہُوا؛ چنانچہ زور سے کھینچنا شروع کیے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی کی طرح میری چھوٹی بیٹی دُرِّ نجف کمرے میں آئی اور اُسی طرح چلی بھی گئی۔ تمام گھر میں شور مچ گیا کہ ابّو نے کان پکڑ رکھے ہیں اور اپنے آپ کو سزا دے رہے ہیں۔

"کیا سزا دے رہے ہیں؟"

دُرِّ نجف ہی بولی: "چونکہ لات کو ابّو نے مجھے مارا تھا اِس لئے اب وہ توبہ کر لے ہیں"۔

ایک دفعہ دونوں کانوں میں ریح کا درد اِس زور سے ہوا کہ جب خود کان کھینچ کر تھک گیا، تو دوستوں سے کان کھنچوانے پڑے۔ اِدھر دوستوں کو اللہ ایسا موقع دے۔ اُنہوں نے کچھ لحاظ کیے بغیر اتنے زور سے کان کھینچے کہ کئی روز تک وہ کان کے بجائے بالوشاہی نظر آتے رہے۔

ایک شام کا ذکر ہے بیگم کی کچھ سہیلیاں ہمارے گھر تشریف لائیں۔ اُس دن اتّفاق سے ہم بھی خلافِ معمول نہائے دھوئے اور سولہ سنگھار کیے بیٹھے تھے (سولہ کا عدد ہم نے محاورۃً استعمال کیا ہے، ورنہ بالوں میں کنگھا بھی پھیرتے ہیں تو بیگم چلّا اُٹھتی ہیں، خیر تو ہے کدھر کے ارادے ہیں؟)، بہر حال اُس دن ہم کچھ آدمی کا بچّہ دکھائی دے رہے تھے۔ مہمانوں میں سے ایک نے تو ہماری بیگم سے صاف صاف کہہ دیا: "سعیدہ! تمہارے میاں تو اچھے خاصے نظر آتے ہیں۔ تم اُنہیں صاف سُتھرا کیوں نہیں رکھتیں"۔ ہمیں اُس دن پہلی بار شدّت سے احساس ہُوا کہ عورت کی معمولی سی تعریف بھی مرد کو ہواؤں میں کہیں سے کہیں اُچھال سکتی ہے؛ چنانچہ ہم بھی اُس وقت ہواؤں میں اُڑے جا رہے تھے کہ بیگم نے ہمارے پہلو میں ایک زوردار چٹکی لی۔ ہمیں اِس مذاق یا وارننگ کی اُس وقت بظاہر کوئی وجہ نظر نہ آئی، یوں ہم ذرا سنبھل کر ضرور بیٹھ گئے۔ ایک لمحے بعد دوسری چٹکی اور پھر تیسری۔ لاحول ولا قوۃ! بیگم کو اس وقت یہ کیا مذاق سوجھ رہا ہے۔ ہم نے نگاہ

اُٹھا کر دیکھا تو بیگم ہم سے قطعی طور پر بے خبر ہو کر اپنی سہیلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں اور اُن کے دونوں ہاتھ بھی باتیں کر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ اِس دوران میں جونہی ریح کا درد ہمارے پہلو میں دَر آیا، لاشعوری طور پر ہم نے خود اپنی چٹکیاں لینا شروع کر دی تھیں۔ چلیے آدمی اپنے پہلو میں خود چٹکیاں لینا شروع کر دے تو اس فعل کی خبر دوسروں کو نہیں ہو پاتی۔ ہم پر ایسے عالم بھی گزرے ہیں کہ بھری محفل میں ریح کا درد ہمارے رُخساروں میں آ گیا اور ہم نے خود اپنے کلّے نوچنے کے بجائے بزعمِ خود یہ بہتر سمجھا کہ اِن کلّوں میں خوب زور سے ہَوا بھری جائے جس کے نتیجے میں ہماری شکل اُس سپیرے ایسی ہو گئی جو بین بجا رہا ہوتا ہے۔ آخر ایک دن بیگم نے کہہ ہی دیا "اجی مَیں نے کہا، آپ کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے کہ بین بجانے والے سپیرے کی طرح کلّے پھُلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یقین کیجیے اِس حرکت سے آپ کے پچکے ہوئے رُخساروں میں قطعی حُسن پیدا نہیں ہوتا۔"

مَیں ذاتی طور پر ریح کے درد کی ہر ادا برداشت کر لیتا ہوں، لیکن اُس کی ایک ادا سے میرے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک رات مَیں اپنے مکان کی چھت پر کھُلے آسمان کے نیچے اپنے پلنگ پر پڑا ہوا تارے گِن رہا تھا۔ واضح رہے کہ تارے مَیں اپنی مرضی سے گِن رہا تھا۔ کسی کے انتظار میں نہیں، کیونکہ میرا محبوب (یعنی میری بیوی) تو برابر والے پلنگ پر آرام سے لیٹی خراٹے لے رہی تھی۔ عموماً مجھ پر یہ نزولِ شعر کا وقت ہوتا ہے؛ چنانچہ اُس وقت بھی مجھے ہر ستارے کے ساتھ ایک شعر جھلملاتا نظر آ رہا تھا کہ اچانک ریح کا درد میرے پھیپھڑوں میں آ گھُسا۔ مجھے اُس وقت سانس لینا دشوار ہو گیا، یوں لگا جیسے میری کمر میں اُوپر کی طرف کسی نے سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہے۔ تمام شعر، تمام ستارے ایک دم غائب ہو گئے۔ یا اللہ، اب کیا ہو گا؟ بڑی مشکل سے بیگم کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ اعلان کیا "مر رہا ہوں"۔ وہ بولی "جانے بھی دیجیے۔ آپ کو یکایک یہ مَرنے کی کیا سُوجھ جاتی ہے؟"

"پھیپھڑوں میں ریح کا درد گھُس آیا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے، درد تو کہیں نہ کہیں آپ کے جسم میں گھُستا ہی رہتا ہے۔" بیگم نے نہایت اطمینان سے دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

مجھے محترمہ کی اس ادا پر سخت غصّہ آیا "جان نکل رہی ہے اور تمہیں آرام سُوجھ رہا ہے، خدا کی بندی، کوئی علاج ہی بتاؤ؟"

"دو چار قلا بازیاں لگائیے، درد بھاگ جائے گا۔"

"قلا بازیاں؟"

"اوہو، اگر یہ نہیں لگا سکتے تو پانچ دس ڈنٹر پیل لیجئے۔" اُس رات مَیں صبح تک بے چین رہا۔

قصّہ مختصر ریح کا درد کبھی کبھی مجھے خاصا پریشان کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میری اس پریشانی سے میرے آس پاس والے پریشان نہیں ہوتے۔ مَیں نے اِس درد کے بارے میں ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ اوّل تو وہ ریح کے اِس طرح قائل ہی نہیں جس طرح مَیں ہوں۔ مجھے تو ریح جن، بھوت، فرشتہ، معلوم نہیں کیا کیا محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ زندہ اسداللہ غالب قصوری (مرحوم نہیں) میرے گھر آئے، کہنے لگے: "مشکور صاحب، اس وقت کیا کر رہے تھے؟" عرض کیا: "ریح کے درد پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اس کا کوئی مناسب سا عنوان نہیں سُوجھ رہا ہے۔"

بولے: "آپ نے اب تک کیا سوچا؟"

"ریح کے درد کا سفر۔"

فرمایا: "یہ تو مزے دار عنوان نہیں۔"

عرض کیا: "اسی لئے تو آپ سے پُوچھ رہا ہوں۔"

کہنے لگے: "چونکہ آپ کا یہ درد خاصا شوخ بھی ہے اور کھٹور بھی، اس لئے اس کا عنوان اس مشہور فلمی گیت پر رکھ دیجئے: "تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا۔" چنانچہ اسی عنوان کے ساتھ قارئین کی خدمت میں یہ مضمون حاضر کر رہا ہوں۔ مَیں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اس مضمون کو لکھتے وقت ریح کے درد نے مجھے ایک بار بھی نہیں گدگدایا۔

قبولِ نکاح

نکاح پڑھاتے وقت مولوی صاحب جب دُولہا میاں سے پُوچھتے ہیں کیوں برخوردار تمہیں فلاں بنتِ فلاں بطور بیوی منظور ہے تو دُولہا میاں جس انداز میں جواب دیتے ہیں، مجھے وہ انداز ہمیشہ عجیب سا لگا۔ کچھ صاحبان تو ایسے وقت میں شرماتے اِس طرح ہیں گویا نکاح نہیں پڑھوا رہے اپنے پہلو میں گُدگدی کروا رہے ہیں۔ کچھ صاحبان ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے یہ ابھی لڑکی کو لے کر فرار ہو جائیں گے؛ چنانچہ مَیں نے اپنے نکاح سے پہلے یہ مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ انشاء اللہ مَیں نہ تو حد سے زیادہ شرماؤں گا اور نہ حد سے زیادہ بے حجابی اور بے تکلفی کا مظاہرہ کروں گا بس اس کے بین بین رہوں گا اور اہلِ ذوق پر واضح کر دوں گا کہ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" — میری مراد شائستہ، متوازن اور معتدل افراد سے ہے؛ لہٰذا جب میرے نکاح کا وقت قریب آیا یعنی مولوی صاحب میرے پہلو میں آکر بیٹھے مجھے فوراً یاد آیا کہ اے مشکور! ہشیار ہو جاؤ کہ تمہیں اپنی شائستگی، توازن اور اعتدال ایسی بلند پایہ صفات اسی وقت اور ابھی دکھانا ہیں۔ مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا: "لیکن اس کے لیے کیا تیاری کرنی چاہیئے؟"

دل نے جواب دیا: "بس ایک ہی تیاری ہے اور اُس کا نام ہے احتیاط"۔ یہ جواب سُن کر مَیں فوراً "محتاط" ہو کر بیٹھ گیا۔ غالباً اِس عزم کے طفیل مجھے معمولی سا اُچھلنا پڑا جس کے نتیجے میں برابر بیٹھے ہوئے ایک دوست نے پُوچھا: "پیارے کیا بات ہے، کسی چیز نے کاٹ لیا ہے؟" مَیں نے دوست کے سوال کا جواب نہ دیا اور جواب دیتا بھی کیا۔ میں تو

مولوی صاحب کے سوال کا جواب اور وہ بھی صرف ایک لفظ یعنی ہاں میں دینے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا مولوی صاحب جب مجھ سے پوچھیں گے تمہیں فلاں بنت فلاں منظور ہے، مَیں اِس خوبصورتی کے ساتھ جی یا ہاں کہوں گا کہ نہ صرف مولوی صاحب بلکہ تمام براتی عش عش کر اُٹھیں گے اور میرے سسرال والے تو میری اِسی ادا پر فریفتہ ہو کر رہ جائیں گے۔ میرے خیال میں دولہا کی طرف سے جو پہلا لفظ دُلہن والوں کے لیے معنی رکھتا ہے وہ یہی جی یا ہاں ہے۔ اِس جی یا ہاں کو آپ نہایت مری ہوئی آواز میں بھی ادا کر سکتے ہیں، نہایت کرخت آواز میں بھی اور نہایت بے باک آواز میں بھی۔ اب یہ آپ کی شخصیّت پر منحصر ہے کہ آپ کس انداز میں یہ جی یا ہاں اپنی زبانِ مبارک سے برآمد فرماتے ہیں۔ اگر آپ کی شخصیّت کمزور ہے تو آپ اسی جی کو نون غنّہ کے ساتھ جیں کہہ کر ادا کریں گے۔ اگر آپ خدانخواستہ نرے گنوار اور اُجڈ آدمی ہیں (میں صرف فرض کر رہا ہوں) تو یہی جی کا لفظ گول ہو کر جیم کی صورت اختیار کر جائے گا۔ میرا مطلب ہے آپ کی زبان سے جی کے بجائے جیم نکلے گا۔ غرض قبولِ نکاح کے وقت کا یہی ایک لفظ جی یا ہاں آپ کی پُوری شخصیت کے مکمّل اظہار کا موجب بن سکتا ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ایک پولیس آفیسر دوست کی شادی ہونے لگی۔ نکاح پڑھانے کے لیے پولیس ہی کے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ ان مولوی صاحب نے جیسے ہی دولہا صاحب کے کان میں یہ پُوچھنے کے لیے کہ کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں منظور ہے اپنا منہ ڈالا تو فوراً سیدھے کھڑے ہو گئے اور باقاعدہ سیلوٹ مار کے لفٹ رائٹ کرتے ہوئے پنڈال سے باہر چلے گئے۔ سب حیران ہوئے کہ یہ کیا ماجرا پیش آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جیسے ہی مولوی صاحب نے دُولہا کے کان میں اپنا مُنہ ڈال کر یہ پُوچھا کہ کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں منظور ہے، تو اس بات کو دُولہا صاحب جلدی سے نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے اپنے پولیس والے لہجہ میں مولوی صاحب سے پُوچھا "کیا مطلب"؟ اب چونکہ مولوی صاحب دُولہا صاحب کے ماتحت تھے، یہ سمجھے دُولہا صاحب فرما رہے ہیں STAND UP کھڑے ہو جاؤ؛ چنانچہ غریب مولوی صاحب حکم حاکم مرگِ مفاجات کے پیشِ نظر فوراً کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں دولہا صاحب کی سمجھ

میں آگیا کہ مولوی صاحب تو قبولِ نکاح کے بارے میں پوچھ رہے تھے؛ چنانچہ انہوں نے یعنی دُولہا صاحب نے پھر اپنے پولیس والے لہجے میں کہا "جی ہاں منظور ہے"۔ جیسے مولوی صاحب سمجھے دولہا میاں فرما رہے ہیں" کھڑے کیا ہو۔ دفع ہو جاؤ"۔

اسی طرح ہمارے ایک چٹورے دوست کی شادی ہونے لگی۔ ہم نے اُسے شادی سے پہلے بہت سمجھایا کہ یار دیکھو اپنے چٹورپن سے باز آجاؤ، تمہیں آج کل بہت زیادہ کھانسی ہو رہی ہے۔ سب کام چھوڑ کر (یعنی طرح طرح کی چیزیں کھانا چھوڑ کر) پہلا کام یہ کرو کہ کھانسی کا علاج کراؤ۔ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ اِدھر آدمی کی شادی ہو رہی ہے اور اُدھر وہ مسلسل کھانسنے میں مصروف ہے یا دُولہا صاحب دُلہن کے کمرے میں کھانستے ہوئے داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارا وہ دوست بولا:

"خیر دُلہن کے کمرے میں تو آدمی کو کھانستے ہوئے ہی داخل ہونا چاہیئے"۔

"وہ کیوں؟"

"اِس طرح دُلہن پر دُولہا کا رُعب خواہ مخواہ پڑتا ہے"۔

"تم سمجھتے ہو کھانسنے سے رُعب پڑتا ہے"۔

"بالکل"۔

"تو بھائی پھر تم کھانستے پھرو۔ ہمارا کام تمہیں سمجھانا تھا آگے تم جانو اور تمہاری کھانسی"۔

ہم یہ کہہ کر واپس گھر آگئے اور پھر ہمیں ایک کام سے اسلام آباد جانا پڑا۔ واپس آئے تو اگلے روز ہی ہمارے اِس دوست کی شادی تھی؛ چنانچہ ہم بن سنور کر اُس کے ہاں پہنچے اور وہاں سے بارات میں شامل ہو کر دُلہن کے گھر آدھمکے۔ ہم چونکہ دُولہا میاں کے خاص دوستوں میں سے تھے، اس لیے پنڈال میں عین دُولہا صاحب کے قریب ہمیں جگہ ملی۔ ہم نے دیکھا کہ دُولہا صاحب قدرے بے چین ہو رہے ہیں۔ اُن کے قریب آکر بے چینی کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے: "یار کھانسی اُٹھ رہی ہے"۔

"میں کیا کروں؟" میں نے غصّہ میں آکر جواب دیا۔

"کوئی تدبیر سوچو" اُس نے نہایت ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"فی الحال تو یہی تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک مولوی صاحب اندر سے تشریف لائیں تم جی کھول کر کھانس لو۔"

"دولہا نے مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھا؟ یار تمہیں کبھی کھانسی ہوئی ہے؟"

"ہاں ہوئی ہے۔"

"تو تم پر خدا کی لعنت! کیا یہ نہیں جانتے کہ کھانسی رکی رہے تو رکی رہے جب اٹھتی ہے تو آسانی سے نہیں بیٹھتی۔"

"اگر یہ بات ہے تو نہ کھانسو۔"

"یار کیسے بے دردی کے ساتھ جواب دے رہے ہو" وہ اپنی سانس روکتے ہوئے بولا۔

"اور کیا تمہاری مرضی یہ ہے کہ میں تمہاری جگہ کھانسنا شروع کر دوں۔ اگر تم سمجھتے ہو میرے کھانسنے سے تمہاری تسلی ہو جائے گی تو لاؤ یہ کام بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے" ؟ میرے دولہا دوست نے غصہ سے کہا۔

"مذاق بالکل نہیں سوجھ رہا بلکہ اس کے برعکس تم پر غصہ آ رہا ہے۔"

"بہر حال یہ غصے کا وقت نہیں۔"

"تو پھر میرا پرخلوص مشورہ یہی ہے کہ مولوی صاحب کے آنے سے پہلے جتنا زور سے کھانس سکتے ہو کھانس لو۔"

"اچھا اگر تم اسے بہتر سمجھتے ہو تو میں کھانس لیتا ہوں" اور یہ کہہ کر دولہا صاحب نے کھانسنا شروع کیا تو واقعی اب اُن کی کھانسی تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ میں نے جب دیکھا کہ دولہا کا کھانستے کھانستے برا حال ہوا جا رہا ہے تو قریب ہی کھڑے ہوئے میراثیوں سے کہا، "ارے دیکھ کیا رہے ہو۔ دولہا کا سہرا گانا شروع کر دو۔ پہلے تو میراثی ذرا ہچکچائے، لیکن میں نے ڈانٹ کر کہا تو انہوں نے سہرا گانا شروع کر دیا" میرا خیال تھا کہ میراثی سہرا گائیں گے تو اُن کے شور میں دولہا کی کھانسی کی آواز دب جائے گی اور زیادہ ہی اٹھی تو یوں لگے گا جیسے دولہا صاحب خود سہرے کی داد دے رہے ہیں؛ چنانچہ کچھ ایسا ہی ہوا اُدھر طبلے کی تھاپ پڑتی تھی اور ادھر دولہا صاحب کھانستے تھے۔ اس عمل کو جاری ہوئے ابھی دو چار منٹ

ہی گزرے تھے کہ دُولہا کے والد صاحب غصّہ میں گرم دولہا کے قریب آئے اور کہنے لگے:
"بے حیا! شرم نہیں آتی۔ نکاح پڑھوانے سے پہلے ہی سہرا گوا رہا ہے اور پھر ڈھیٹ پن دیکھو کہ داد بھی خود ہی بڑھ چڑھ کر دے رہا ہے"۔ ہم نے میراثیوں کا گانا بند کرایا۔ ادھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دُولہا صاحب کی کھانسی بھی رُک گئی۔ مَیں نے دولہا کے قریب جا کر پُوچھا: "کہو یار میری تدبیر کارگر ہوئی؟"
کہنے لگا: "ایک دفعہ تو دَم نکلنے کو ہو گیا تھا۔ بہرحال اِس وقت خاصا آرام محسوس کر رہا ہوں۔ اب جلدی سے مولوی صاحب کو بُلا لو"۔
"وہ اندر تمہاری بیگم کی رضامندی حاصل کرنے گئے ہیں"۔
"انہیں اندر گئے تو کافی دیر ہو چکی کہیں..."۔ دُولہا نے اندیشے کا اظہار کیا۔
"کہیں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"
"میرا مطلب ہے کہیں اُس نے انکار تو نہیں کر دیا"۔
"ہو سکتا ہے کھانسنے والے دُولہا سے تو بہتر یہ ہے کہ دلہن بغیر دُولہا ہی کے رہے"۔
ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مولوی صاحب اندر سے تشریف لے آئے۔ آتے ہی چند لمحے بیٹھنے کے بعد انہوں نے دُولہا کے قریب ہو کر پُوچھا: "کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں..."۔ ابھی مولوی صاحب نے دلہن کا نام بھی نہ لیا تھا کہ دُولہا صاحب کو پھر کھانسی اُٹھ گئی۔ اب مولوی صاحب بیٹھے دُولہا صاحب کا مُنہ تک رہے ہیں اور دُولہا صاحب ہیں کہ مسلسل کھوں کھوں... کھائیں کھائیں کئے جا رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے دُولہا کی کھانسی رُکی تو مولوی صاحب نے دوبارہ دُولہا صاحب سے پُوچھنا شروع کیا، لیکن اس دفعہ بھی مولوی صاحب نے دُلہن کا نام بھی پُوری طرح ادا نہ کیا تھا کہ دُولہا صاحب کو کھانسی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مولوی صاحب پھر ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد کھانسی نے دم لیا تو مولوی صاحب نے دُولہا کے قریب ہو کر پھر سوال کیا: "کیا آپ کو..."۔ اس دفعہ تو مولوی صاحب نے یہ تین لفظ ہی ادا کئے تھے کہ دُولہا پر کھانسی کا پھر حملہ ہو گیا۔ غرض بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد مولوی صاحب دُولہا صاحب سے قبولِ نکاح کرانے میں کامیاب ہو سکے۔

قبولِ نکاح کا ہم نے ایک اور منظر بھی دیکھا ہے۔ ہمارے ایک عزیز کی شادی تھی۔ اتفاق سے ہمارے یہ عزیب عزیز ہکلاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے جوان کے قریب آکر پوچھا: "کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں سے نکاح منظور ہے"، تو دولہا نے فوراً جواب دیا یا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا: "ماں... ماں... ماں..." گویا وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ منظور ہے۔ مولوی صاحب نے فوراً دولہا کے والد کو پاس بُلا کر کہا: "دولہا میاں اس وقت اپنی اماں کو یاد فرما رہے ہیں"۔ دولہا کے والد کو غصہ آگیا۔ کہنے لگے: "ارے مردود۔ اس بھری محفل میں اپنی اماں کو بُلا کر کیا کرے گا"۔ والد صاحب کی اس ڈانٹ پر دولہا نے احتجاج کرتے ہوئے فرمایا: "نا... نا... نا" یعنی مَیں نے ایسا نہیں کہا جس کو مولوی صاحب نے سمجھا کہ دولہا میاں اب اپنے نانا صاحب کو بُلا رہے ہیں۔ اس پر دولہا کے والد صاحب کہنے لگے: "مولوی صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ دولہا بولتے ہوئے ذرا ہکلاتا ہے۔ آپ قدرے صبر سے کام لیں۔ یہ آپ کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے گا"۔ غرض یہاں بھی خاصی تگ و دو کے بعد نکاح پڑھنے والے مولوی صاحب دولہا کو ایجاب و قبول کی منزل سے گزار سکے۔ یہ الگ بحث ہے کہ دولہا کے اس ماں... ماں... ماں... اور نا... نا... نا کہنے یعنی ہکلانے کا اثر دلہن والوں پر اچھا نہیں پڑا اور اُن کی آپس میں تکرار ہوتی رہی کہ بردکھوے کے وقت دولہا کو صرف دیکھنے پر کیوں اکتفا کیا گیا اُس سے بات چیت کیوں نہیں کی گئی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قبولِ نکاح کے وقت کا ایک لفظ جی یا ہاں آدمی کا بہت کچھ پول کھول کر رکھ دیتا ہے۔

ہمارے ایک اور پٹھان دوست ہیں جو شاید اندر سے اتنے خان صاحب نہ ہوں جتنے باہر سے ہیں۔ اُن کی شادی ہونے لگی تو اتفاق سے ہم اُس میں بھی شامل تھے۔ خان صاحب بڑے سجیلے اور بانکے نوجوان تھے۔ دولہا کے لباس میں بہت سج رہے تھے۔ جس وقت دلہن والوں کے یہاں بارات پہنچی اور اُنہوں نے دولہا کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ نکاح خوانی کا وقت قریب آیا تو مولوی صاحب نے خان صاحب کے قریب آکر پوچھا: "کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں منظور ہے"۔ خان صاحب نے ایک دم چونک کر

کہا:"خامولوی صیب اآپ یہ ہم سے کیا پوچھتا ہے:"

"جناب میں آپ سے یہ پُوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں سے نکاح کرانا منظور ہے:"

"مولوی صیب کیسی بات کرتا ہے اگر منظور نہ ہوتا تو ہم یہاں کیوں آتا:"

"پھر بھی یہ پُوچھنا میرا فرض ہے:"

"ہاں ہاں مولوی صاحب بولو تمہارا کیا فرض ہے:"

"یہی کہ کیا آپ کو فلاں بنت فلاں..."

"او مولوی صیب یہ آپ نے کیا بار بار ایک ہی بات کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کوئی نئی بات پُوچھو:"

"خان صاحب جب تک آپ میری اِس بات کا جواب نہ دیں گے، مَیں نکاح نہیں پڑھ سکتا:"

"اپنے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پوچھو آپ کیا پُوچھنا چاہتا ہے:"

"میں پُوچھتا ہوں کیا آپ کو فلاں بنت فلاں.:"

"بس... بس مولوی صاحب چُپ کرو۔ آپ نے کئی بار سب لوگوں کے سامنے ہمارا ہونے والی بیوی کا نام لیا ہے۔ آپ کو شرم آنا چاہیئے:" اِس پر مولوی صاحب کو بھی غصّہ آگیا۔ وہ لاحول پڑھ کر جانے لگے تھے کہ ہمارے دوست کے چچا نے اُن کو سمجھایا بُجھایا اور بڑی مشکل سے دُولہا نے مولوی صاحب کے سوال کا جواب دیا، لیکن اِس طرح ہاں کہی جیسے اُن کے لٹھ مار رہے ہوں:"ہمیں منظور ہے... منظور ہے... منظور ہے:"

اِن دو چار واقعات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ نکاح خوانی کے وقت دُولہا کا ہاں کہنا کتنی اہمیّت رکھتا ہے؛ چنانچہ جب مولوی صاحب نے مجُھ سے پُوچھا: برخوردار کیا آپ کو فلاں بنتِ فلاں منظور ہے تو مَیں نے پہلی دفعہ اِس طرح ہاں کی کہ مولوی صاحب کو سُنائی ہی نہ دی۔ موصوف نے فرمایا:"عزیزم جب تک آپ واضح طور پر ہاں نہیں کہیں گے مَیں نکاح نہیں پڑھ سکتا:" چنانچہ مولوی صاحب کے سوال پر مَیں نے دوبارہ ہاں کی تو وہ

بھی کچھ میرے حلق سے باہر نکلی کچھ اندر رہ گئی جس پر ہمارے تایا جان کو بہت غصّہ آیا کہنے لگے "برخوردار ویسے تو شادی شادی کی رٹ لگا رکھی تھی۔ اب موقعہ آیا ہے تو مُنہ سے ایک لفظ اچھّی طرح ادا نہیں ہو رہا ہے۔ ذرا حوصلے کے ساتھ ہاں کہو؛ لہٰذا اب جو میں نے ہاں کی تو اس زور سے کہ ساری محفل زعفران زار بن گئی گویا ہم نے ہاں ہاں کے بجائے بطخ کی طرح قیں قیں کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن بہرحال مولوی صاحب نے ہمارا نکاح پڑھ دیا اور ہم ایک عدد بیوی کے شوہر بن گئے۔

دن میں تارے

مجھے کسی کام سے چوبرجی جانا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بھائی ظہیر عالم چلے آرہے ہیں۔ مَیں جاتا جاتا رُک گیا۔ انھوں نے چند لمحوں بعد ہی محسوس کر لیا کہ مَیں دلجمعی کے ساتھ ان کے پاس نہیں بیٹھا ہوں۔ کہنے لگے: "بھائی مشکور! سچ سچ بتایئے کیا پریشانی ہے؟"

"کوئی پریشانی نہیں۔"

"پریشانی سے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میری آمد پر اتنے خوش نہیں ہوئے جتنا کہ ہوا کرتے ہیں۔"

"خوش تو ہوا ہوں۔"

"میں ابھی تک اپنا مافی الضمیر واضح نہیں کر سکا۔ اگرچہ آپ یہ ضرور سمجھ گئے ہیں کہ مَیں کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں تھی؟ کہیں جا تو نہیں رہے تھے؟"

"جانا تو تھا لیکن تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا۔"

"پھر تو میرا اندازہ درست نکلا۔"

"آپ ماشاء اللہ ذہین آدمی ہیں۔"

"اچھا میری یہ مدح سرائی چھوڑیئے اور بتایئے کہاں جا رہے تھے؟"

"چوبرجی۔"

"بس اتنی سی بات تھی جسے آپ نے افسانہ بنا ڈالا ہے۔ اُٹھیے اور میرے ساتھ چلیے۔"

"آپ کے ساتھ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میرے اسکوٹر پر پیچھے بیٹھ جائیے۔"

"مگر۔۔۔۔ آپ تو۔۔۔۔"

"مانا کہ ایک اچھا ڈرائیور نہیں لیکن تجربہ کار ضرور ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"کئی دفعہ حادثات کا شکار ہو چکا ہوں۔"

"اور پھر بھی آپ مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔"

"اس لئے کہ آپ کو معلوم ہو جائے میں حادثات کی پروا نہیں کرتا۔"

"لیکن میں تو پروا کرتا ہوں۔"

"اسی لئے تو سوچ رہا ہوں کہ آپ کے دل سے بھی خوف دُور کر دیا جائے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب بہت واضح ہے۔ اوّل تو تجربات کی بنا پر حادثہ نہیں ہونے دوں گا اور اگر فرض کیجیے حادثہ وقوع میں آ بھی گیا تو میں آپ کو اس سے بال بال بچا کر گھر واپس لے آؤں گا۔"

"اگر واپس گھر نہ لائے تو۔۔۔۔؟"

"دیکھیے، موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، مگر دونوں صورتوں میں آپ کا گھر آنا یقینی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ گیا اور اس میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں بچ گیا تب تو اس میں کسی قسم کے شبہے کی گنجائش ہی نہیں کہ میں آپ کو آپ جس حالت میں بھی ہوں گے مُردہ یا زندہ ضرور گھر لے آؤں گا ۔۔ اور اگر فرض کیجیے ہم دونوں حادثے کا شکار ہو گئے تب بھی آپ کا اور میرا گھر پہنچ جانا پکّا ہے۔ میں ہر وقت اپنا پتہ اپنی جیب اور اسکوٹر کی ڈگی میں رکھتا ہوں ۔۔۔ اور یہ لیجیے آپ کا نام اور پتہ بھی ڈائری میں لکھ لیتا ہوں،" یہ کہہ کر ظہیر نے سچ مچ جیب میں سے ڈائری نکالی اور میرا پتہ بھی لکھ ڈالا۔ ساتھ

ہی یہ عبارت بھی لکھ دی کہ ہم فلاں وقت فلاں جگہ جا رہے ہیں اور میرے ساتھی کا پتہ یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مَیں نے کہا: "بھائی! اب تو میں آپ کے ساتھ جانے کو بالکل تیار نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"آپ تو حادثے کا پورا انتظام کر کے چل رہے ہیں۔"

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اس سے تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیئے۔"

غرض تھوڑی سے ہچکچاہٹ کے بعد مَیں ظہیر عالم کے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔ چلتے چلتے انہوں نے میری بیوی سے کہا: "بھابی چائے کے لئے پانی چولھے پر رکھیے ہم ابھی پانچ منٹ میں واپس آتے ہیں۔" ادھر میں ابھی طرح بیٹھا بھی نہ تھا کہ ظہیر نے اسکوٹر سٹارٹ کیا اور اس زور سے رفتار تیز کی کہ اگر سیٹ کے پیچھے کیریر کو پکڑ نہ رکھا ہوتا تو لازمی طور پر مَیں گر جاتا ـــ مَیں نے عرض کیا: "بھائی ایسی کوئی جلدی نہیں آپ آرام سے چلیئے۔"

قہقہہ لگاتے ہوئے بولے: "ارے آپ! ڈر گئے؟"

"جی ہاں سو فی صد ڈر گیا ہوں۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" رفتار کم کرتے ہوئے فرمایا۔ "ویسے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے مجھ سے بے شمار حادثات سرزد ہوئے ہیں، لیکن ایک دو حادثات میں مرتے مرتے بچا ہوں۔"

"مرتے؟ مرتے؟"

"جی ہاں، بلکہ یوں کہیئے کہ مر ہی چلا تھا۔"

مَیں نے گھبرا کر کہا "خدا کے لئے مجھے یہیں اُتار دیجیے۔"

"ارے میری بات تو سُنیں۔" انہوں نے اسکوٹر ذرا مزید ہلکا کرتے ہوئے کہا۔ "معمولی حادثے میں تو تھوڑی بہت تکلیف ہوتی بھی ہے۔ اگر بڑا حادثہ ہو جائے تو پھر کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

"تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بڑا حادثہ ہو جائے۔" میرے اس طنزیہ فقرے کو

سُنا اَن سُنا کرتے ہوئے بولے:

"جی ہاں بڑے حادثے میں آدمی فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے اور بے ہوش ہونے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ شاید کچھ مزہ ہی آتا ہے۔"

مَیں نے جھنجلا کر کہا: "آپ نے میری بات سُنی۔"

"ہاں سُنی۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کو حادثات سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔"

"مَیں حادثات سے ڈرتا ہوں اور مجھے خواہ مخواہ حادثات کا شکار ہونا قطعی پسند نہیں۔" میں نے صاف طور پر اعلان کیا۔

"میں جان کر کب کسی حادثے کا شکار ہوا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

مَیں نے دوبارہ بات شروع کی۔

"تیز رفتاری بھی تو"... زئیں... زئیں — پتہ چلا کہ وہ عین بازار میں تیس میل کی رفتار سے چلے جا رہے تھے کہ آگے سے کچھ گائے بھینسیں آئیں تو ایکدم رفتار کم کی — کہنے لگے: "یقین کرو۔ مَیں تیز نہیں چلاتا، بلکہ ہاتھ خود بخود گھوم جاتا ہے۔"

"کم از کم اس وقت تک اپنے اس ہاتھ کو ضرور قابو میں رکھئے جب تک میں آپ کے پیچھے بیٹھا ہوں۔"

اب ہم پُونچھ روڈ پر آ چکے تھے اور ظہیر عالم نہایت معمولی رفتار کے ساتھ اسکوٹر چلا رہے تھے۔ مَیں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے: "شکریہ کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں امتحان لے رہا تھا۔ چونکہ آپ اس میں قریب قریب فیل ہو چکے ہیں اس لئے کم از کم فی الحال میرا ارادہ نہیں ہے کہ آپ کو دوبارہ امتحان میں ڈالا جائے۔" مَیں دوسری مرتبہ شکریہ ادا کرنے لگا تو قدرے سنجیدہ ہو کر بولے: "دیکھو جی! مجھے وہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے جو بلا وجہ کسی کے شکر گزار ہوتے ہیں۔"

اتنے میں ہم چوبرجی پہنچ گئے۔ مَیں نے جلدی سے کام ختم کیا اور پھر ہم دونوں گھر کی طرف لوٹے۔ ظہیر عالم واپسی پر اطمینان سے اسکوٹر چلا رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: "کیوں بھائی

مشکور! کیا واقعی آپ کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا؟"

"معلوم نہیں حادثہ سے آپ کی مُراد کیا ہے؟"

"حادثہ تو حادثہ ہی ہوا کرتا ہے۔"

"مگر کیا آپ حادثہ کی قسموں کے قائل نہیں ہیں۔"

"ہوں۔"

"تو پھر کونسا حادثہ پوچھ رہے ہیں — ایسا حادثہ جو آدمی کو ہلاک کر سکتا ہے؟"

"معاف کیجئے میں اس حادثہ کو حادثہ نہیں مانتا جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ ایسے حادثے میں کم از کم صاحبِ حادثہ کو کچھ نہیں ہوتا — وہ یا تو بے ہوش ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔"

"پھر آپ کون سے حادثے کی بابت پوچھ رہے ہیں؟"

"وہ حادثہ جو آدمی کو کسی طرح کا سچا شعور عطا کرتا ہے۔"

"یعنی یہ حادثے کی کوئی نئی قسم ہے؟"

"بہت پرانی! بلکہ سچ پوچھئے تو کوئی بات سمجھ میں ہی حادثے کے ذریعے آتی ہے اور مَیں ایسے حادثہ کو گیان کھنڈت یعنی حادثہ معرفت کہا کرتا ہوں۔"

"مجھے یہ حادثہ بھی پیش نہیں آیا۔"

"پھر آپ پروفیسر کیا خاک بنے پھرتے ہیں اور پروفیسر بھی کیا، ادیب کہیئے۔ ایک ادیب اور شاعر کے لئے تو ایسے حادثوں کا وقوع میں آنا بے حد ضروری ہے۔"

"یہ حادثات کیسے رُونما ہوتے ہیں"؟ مَیں نے بڑے اشتیاق سے پُوچھا — وہ بولے۔

"جس طرح دوسرے حادثے رُونما ہوتے ہیں۔"

"یعنی ان میں بھی چوٹ لگنے یا جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

"کئی بار کہہ چکا ہوں۔ جان کا چلے جانا تو کوئی حادثہ ہی نہیں ہوتا؛ البتہ چوٹ لگنے والی بات از حد ضروری ہے۔"

"چوٹ سے آپ کی مراد خدانخواستہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ کا ضائع ہو جانا ہے۔"

"آخر آپ ہر چیز کی انتہا تک کیوں پہنچ جاتے ہیں؟ چوٹ ایک خراش بھی تو

ہو سکتی ہے۔"

"گویا آپ حادثہ بصورت دِل لگی کے قائل ہیں۔"

"یہاں دل لگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھائی صاحب! حادثہ کے ساتھ سنجیدگی اور احساسِ خطرہ تو بہت ہی ضروری ہیں۔"

"چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"یقیناً ایسی ہی بات ہے۔ یوں چاہے آپ کو خراش بھی نہ آئے لیکن سنجیدگی اور خوف کی موجودگی کے باعث حادثہ کا وقوع میں آنا اپنی جگہ درست کہلائے گا۔"

"اس کے لئے تو کوئی خاص اہتمام ہوتا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی کوئی مثال دیجئے۔"

"ایک نہیں بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"آپ میری طبیعت کو جانتے ہی ہیں — اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ جی میں آئی کہ کسی نوخیز گدھے کی سواری کی جائے، چنانچہ ایک بچہ خر پکڑا اور اس پر سوار ہو گیا، لیکن تھوڑی دُور چلا تھا کہ ظالم نے گرا دیا اور پھر چلتے ہوئے ایک لات بھی رسید کر دی۔"

"یہ کیا حادثہ ہوا۔"

"خوب! آپ کبھی گدھے پر سوار ہوئے ہیں؟"

"کبھی نہیں۔"

"ارے بھائی صاحب گدھے سے گرنا ایک حادثہ اور اس کا لات مارنا حادثہ نمبر ۲ بنتا ہے اور آپ فرما رہے ہیں۔ یہ کیا حادثہ ہوا — میں تو اس دن بیک وقت دو حادثوں کا شکار ہوا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ دن میں تارے نظر آ گئے — اور یہ تارے اس لئے نظر آئے کہ اس شوخ کی

لات پوری نہیں پڑی تھی۔ محض اس کے کُھر کا ایک ذرا سا حصّہ تھا جس نے میری کھوپڑی کو ذرا سا چھُوا تھا۔ اُدھر ٹن کی آواز گونجی اور ادھر دن میں تارے نظر آگئے۔"

"آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس حادثہ کی بدولت آپ کو دن میں تارے نظر آگئے ورنہ۔۔"

"ورنہ کیا — میں دن میں تارے نظر آنے کا قائل ہی نہ تھا اس دن ہوا۔" ظہیر عالم نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "آپ قائل ہیں؟"

"واقعی ابھی تک تو میں بھی اس محاورے کو بس ایک محاورہ سمجھتا ہوں۔"

"جبھی تو کہتا ہوں، آپ کیا ادیب اور شاعر بنے پھرتے ہیں۔"

"نا بھائی! میں ایسے ادیب یا شاعر ہونے کا قائل نہیں کہ جب تک کسی چوپایہ کی لات نہ پڑے کوئی شعور ہی حاصل نہ ہو۔"

"دن میں تارے نظر آنے کے لیے کسی گدھے کی لات کھانا ضروری نہیں۔ مرغے کی لات سے بھی دن میں تارے نظر آسکتے ہیں — اور شاید مجھے گدھے کی لات سے اتنے تارے نظر نہ آئے ہوں، جتنے آپ کو مرغے کی لات سے نظر آجائیں۔"

"مرغے کی لات؟"

"جی ہاں — غالباً آپ نے خونخوار مُرغا نہیں دیکھا۔ پٹھا براہِ راست اُچھل کر حملہ کرتا ہے اور اپنے ساتھ ڈھیلے بھی نکال لاتا ہے۔

مَیں نے قدرے جل کر کہا: "آخر مجھے کیا مصیبت آئی ہے کہ جو مَیں مُرغے سے لڑوں گا؟"

"بھائی صاحب! حادثہ کہہ کر وقوع میں نہیں آتا۔ بس آجاتا ہے۔"

میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ میاں جلدی سے گھر آجائے — ظہیر عالم آرام سے اسکوٹر چلا رہے تھے۔ ہم مسجدِ خضرا کے عقب میں سے گزرے تو مَیں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا اب تو گھر قریب آرہا ہے اور اسی خیال کے ساتھ ہی کسی دھیان میں کھو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ شباب چوک سامنے ہے۔ ابھی اس چوک سے ہم گزرنے ہی والے تھے کہ ظہیر بھائی نے اعلان کیا۔ "بھائی مشکور! حادثہ ہو گیا ہوشیار"۔۔۔ کھٹاک۔۔۔۔ دھڑام۔۔۔۔ چشم زدن میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک ٹیکسی کے نیچے پڑا ہوں اور اس کا پچھلا پہیہ

میرے سر سے لگا ہوا ہے یا میرا سر پچھلے پہیہ کے عین سامنے ہے یعنی ٹیکسی ذرا بھی اچھل پڑتی تو میرے سر کا کچومر نکل گیا تھا۔ میں کس طرح گرا۔ کیسے ٹیکسی کے نیچے آیا ٹیکسی کیونکر رُک گئی۔ ظہیر بھائی کہاں گئے۔ ان کا اسکوٹر کیا ہوا؟ مجھے اس وقت کچھ پتہ نہ تھا۔ میری زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ آخر ایک آدمی نے مجھے ٹیکسی کے نیچے سے نکالا ــــ میں کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ اس شخص نے کہا: "بابو جی کھڑے ہو کر دیکھو۔ آپ کے ہاتھ پاؤں تو سلامت ہیں یا خدانخواستہ کوئی زیادہ چوٹ آئی ہے"۔

میں نے کہا: "کیسے کھڑا ہوں؟" وہ شخص گھبرا گیا ــــ دوسرے لوگوں کو مدد کے لئے پکارنے لگا۔

"اِدھر آؤ، بابو جی کو اٹھاؤ۔ معلوم ہوتا ہے انہیں زیادہ چوٹ آگئی ہے"۔ یہ سن کر دو چار آدمی میری طرف بڑھے۔ کیا دیکھتا ہوں ان میں ظہیر بھی چلے آرہے ہیں۔ ان کے منہ پر چوٹ آئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اور ناک کے اُوپر سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولے "بھائی صاحب بیہوش تو نہیں ہوئے"۔ عرض کیا "نہیں"۔

بولے۔ "اس کا مطلب ہے آپ مرے تو بالکل نہیں"۔

مجھے ہنسی آگئی ــــ "کیا فضول بات کرتے ہو"۔ میرے یہ لفظ سن کر لوگوں سے کہنے لگے "بھائیو! انہیں کچھ نہیں ہوا"۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "کمال ہے، آپ پڑے ہوئے کیوں ہیں۔ اُٹھتے کیوں نہیں ــــ"

"کیسے اُٹھوں؟"

"جس طرح اُٹھا کرتے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر اُنہوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ میں نے زمین پر پاؤں مار کر دیکھا تو واقعی کوئی چوٹ نہ آئی تھی۔ بس معمولی سی ایک دو خراشیں لگی تھیں اور وہ بھی دونوں گھٹنوں اور دونوں ہاتھوں پر۔ لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ظہیر بھائی کے اسکوٹر کو بھی کچھ ایسا نقصان نہ پہنچا تھا۔

کہنے لگے "دراصل یہ خالص حادثہ معرفت تھا جس سے آپ دو چار ہوئے ہیں۔ مُبارک ہو"۔

میں نے پوچھا:"وہ کیسے؟"

بولے:"اچھا جی۔ اب کوئی کسر رہ گئی ہے ۔ ذرا گھر چلیے۔ میں آپ کے منہ سے خود ثابت کرادوں گا کہ آج آپ کو یہ نہایت عمدہ اور بصیرت افروز حادثہ پیش آیا ہے۔"

گھر پہنچ کر ہم لوگ منہ ہاتھ صاف کر کے اطمینان سے بیٹھے تو ظہیر عالم کہنے لگے۔"اب میرے سوالات کا خلوصِ دل کے ساتھ جواب دیتے جانا۔ پھر دیکھئے یہ حادثہ کس طرح حادثۂ معرفت ثابت ہوتا ہے۔"

سوالات پوچھ لیجیے۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ ان کا جواب دوں گا۔"

"کیا آپ کو دن میں تارے نظر آئے؟"

"آئے۔" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

کہنے لگے۔"پھر سوچ لیجیے۔"

عرض کیا۔"جتنا سوچتا ہوں، تاروں کی تعداد اتنی ہی زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔"

"اس کے علاوہ مزید کوئی معرفت ہوئی؟"

"نہیں۔"

"دیکھا آپ پھر اس کی عظمت سے انکار کر رہے ہیں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ ابھی ثابت کرتا ہوں۔"

"کیجیے ثابت۔"

"آپ نے وہ محاورہ سنا ہے، بال بال بچنا۔"

"جی ہاں سنا ہے۔"

"کیا آپ بال بال نہیں بچے؟ ـــــ کیا آپ کے سر اور ٹیکسی کے پہیہ کے درمیان صرف بال ہی نہیں تھے۔"

"بالکل تھے۔"

"تو کیا بال بال بچنے کا محاورہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔"

"آگیا اور اچھی طرح آگیا"۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا جو ابھی تک حادثہ کی معرفت سے جھنجھنا رہا تھا۔

"آج کے حادثے نے آپ کی شخصیت پر ایک نئے انداز سے روشنی بھی ڈالی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں آپ کو ایک کنجوس آدمی خیال کرتا تھا۔"

"اب مجھ سے کون سی سخاوت سرزد ہوگئی۔"

"اس وقت تو واقعی آپ نے کچھ نہیں کیا۔" "پھر؟"

"لیکن اس سے پہلے آپ نے یقیناً کوئی نیک کام کیا ہے۔"

"جان بوجھ کر تو مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہوئی ہوگی۔"

"واہ کیا بات ہے؟"

"کون سی بات۔"

"آپ نے وہ محاورہ سنا ہے۔ لیا دیا آگے آنا۔"

"سنا ہے۔"

"بس آج آپ کے سامنے بھی لیا دیا آگے آگیا۔ مطلب یہ کہ آپ نے کسی کے ساتھ کوئی بھلائی لاشعوری طور پر کی ہوگی۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ فطرتاً سخی آدمی ہیں۔"

"ماشاءاللہ آپ میری تعریف فرما رہے ہیں۔"

"وہ مشہور کہاوت سنی ہے جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔"

"جی۔"

"یوں سمجھئے خدا کو آپ کا زندہ رکھنا مطلوب تھا ورنہ آپ کے مرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔"

"لیکن بھائی یہ کہاوت تو یہاں فٹ نہیں بیٹھتی۔ نہ آپ میرے دشمن تھے اور نہ ٹیکسی والا۔ یہ کہاوت تو اس جگہ بولی جاتی ہے جہاں کوئی کسی کو ہلاک کرنا چاہے لیکن نہ کر سکے۔"

"چلئے آپ میرے اور ٹیکسی والے کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہو جایئے، لیکن

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں میں سے ایک کی بے احتیاطی آپ کو ضرور مارنا چاہتی تھی، لیکن آپ نہیں مرے۔"

"سخت جان جو ٹھہرا۔"

"یونہی سہی۔ آپ کو اس حادثے سے اپنے سخت جان ہونے کا تو عرفان ہوا۔"

"ہوا۔"

"جان کے لالے پڑنا۔ یہ محاورہ سُنا ہے؟"

"سُنا ہے، مگر میرے بھائی یہ محاورہ بھی یہاں زیادہ صادق نہیں آتا۔"

"کم صادق تو آتا ہے؟"

"یوں کھینچ تان کر تو آپ جس محاورہ کو بھی چاہیں گے کچھ نہ کچھ صادق آجائے گا۔"

"مثال کے طور پر نو دو گیارہ ہونا ایک محاورہ ہے آپ اسے یہاں کس طرح فِٹ بٹھائیں گے جبکہ جائے وقوعہ سے نہ میں بھاگا، نہ ٹیکسی والا بھاگا اور نہ کوئی اور — آپ تو خیر بھاگ ہی کیسے سکتے تھے۔ ٹیکسی کے عین نیچے پڑے تھے۔"

"اور کوئی نہ سہی، موت تو ہمیں دیکھ کر نو دو گیارہ ہو گئی تھی۔"

"آپ نے تو واقعی محاوروں کے ساتھ رسہ کشی شروع کر دی، مگر اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ حادثات کے ضمن میں دن میں تارے نظر آنا محاوروں کا بادشاہ ہے۔"

"آپ کی یہ بات درست ہے۔"

"بس تو پھر مجھے آپ سے اور کچھ نہیں منوانا ـــــ میں تو یہی کہنا چاہتا تھا کہ صاحبِ نظر بننے کے لئے دن میں تاروں کا نظر آنا ازبس ضروری ہے اور اس کے لئے کسی نہ کسی حادثہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حادثہ کے بغیر دن میں تاروں کا نظر آنا ناممکن ہے۔"

"ناممکن والی بات غلط ہے، البتہ آپ مشکل کہیں تو زیادہ صحیح ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آدمی ذرا اپنی ذات سے آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرے تو اسے دن میں تارے نظر آسکتے ہیں، چونکہ عام آدمی اپنے سے آگے بڑھ کر دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا، اس لئے

اسے حادثہ کا وسیلہ درکار ہے۔"

"کچھ بھی کہیئے بہر حال میں سمجھتا ہوں، عوام کے لیئے ہی نہیں خواص کے لئے بھی دن میں تارے دیکھنے کی خاطر حادثات کا وقوع میں آنا ضروری ہے۔"

"آپ کی یہ بات غور کرنے کے قابل ہے۔" میں نے یہ کہا تو ظہیر عالم اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگے: "بھائی صاحب آپ خواص میں سے ٹھہرے، غور فرماتے رہیں، میں چلتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"کسی دوسرے حادثے کی تلاش میں یعنی دن میں مزید تارے دیکھنے کے لئے۔"

"کیوں؟"

"مَیں بے چارہ عام آدمی جو ہوا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا اسکوٹر سٹارٹ کیا اور یہ جادہ جا۔ مَیں بہت دیر تک خواص اور عوام کے درمیان کی سولی میں لٹکا ہچکولے کھاتا رہا۔

شیر کی نگاہ

"اے لڑکے اپنی ناک صاف کرو۔"

اور ہم ابھی ناک صاف کرنے کے لئے اپنے کُرتے کا دامن یا ازار بند کا سِرا تلاش ہی کر رہے ہوتے کہ امّی دوبارہ گرجتیں "ادھر آؤ تمہیں کچھ نہیں ملے گا، میں صاف کئے دیتی ہوں"۔ اِس دوسرے حکم پر ہماری رُوح لرز اُٹھتی۔ امّی اِس زور سے ناک صاف کرتیں گویا ناک ہی اُڑا کر رکھ دیتیں۔ بہت دیر تک یوں محسوس ہوتا رہتا جیسے ہمارے چہرے سے ناک غائب ہو گئی ہے اور ہم بغیر ناک کے سانس لے رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ہمیں رونے کی یا کسی قسم کی کوئی آواز نکالنے کی بالکل اجازت نہ تھی؛ لہٰذا ہم اکثر یہ دُعا مانگتے رہتے یا اللہ میاں ہماری ناک نہ آئے، مگر سچی بات یہ ہے کہ ناک نہ آنے کی دُعا ہم صرف اُسی وقت مانگتے جب امّی کے ناک صاف کرنے سے ہمیں تکلیف ہوتی تھی۔ عام حالات میں ہم قطعی طور پر بھول جاتے کہ ناک آرہی ہے تو اب اس کے کٹنے کا وقت بھی قریب ہے۔ ایک دفعہ امّی نے ہماری ناک تازہ تازہ صاف کی تو ہمیں خیال آیا دیکھتے ہیں اس وقت ناک کا کیا حال ہے چنانچہ نزدیک ہی پڑے ہوئے آیئنے کو جونہی اُٹھا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے ہمارے چہرے پر ناک کے بجائے انڈے سے تازہ تازہ نکلا ہوا چڑیا کا بچہ بیٹھا مشکل سے سانس لے رہا ہے۔ ویسی ہی سُرخی تھی اور ویسا ہی نیلا رنگ۔ ہمیں اپنی ناک سے خوف بھی آیا اور گھِن بھی۔ اس کے بعد کئی دن تک ہم نے اپنی ناک کے ہاتھ نہیں لگایا کچھ عجب نہیں کہ کان کے ہاتھ لگانے کے محاورہ کے معنی بھی ہمیں لاشعوری طور پر بذریعہ ناک ہی معلوم ہوئے

ہوں، ناک کے ہاتھ نہ لگانے کے ضمن میں تین چار بار ہماری پٹائی بھی ہوئی ایک دو دفعہ ہم مُرغا بھی بنے آخر ایک دن خلافِ معمول امّی نرم لہجے میں بولیں "کیا بات ہے بیٹے! تم اپنی ناک کے ہاتھ کیوں نہیں لگاتے"۔

"ڈر لگتا ہے"۔

"ہائیں ڈر کس بات کا؟"

"امّی میری ناک کہاں ہے وہ چڑیا کا بچّہ بن گئی ہے"۔

امّی کچھ زیادہ ہی پیار کے موڈ میں تھیں۔ کہنے لگیں "ارے واہ میرے چاند کی ناک تو بہت خوبصورت ہے۔ موتی ہے موتی"۔

"امّی موتی تو آپ میرے دانتوں کو کہا کرتی ہیں"۔

"وہ چھوٹے موتی ہیں اور یہ تمہاری ناک بڑا موتی"۔

امّی کے اس فقرے پر ہم جو خوش ہو کر ذرا زور سے ہنسے تو ہماری ناک پھر آگئی۔ ناک کا آنا تھا کہ امّی نے پھر اُس کی صفائی اُسی صفائی سے کی جو اُن کا معمول تھا اور ہمیں اُسی وقت دوبارہ محسوس ہوا کہ امّی جھوٹ بول رہی تھیں۔ ہماری ناک موتی ووتی کچھ نہیں وہی چڑیا کے انڈے سے نکلا ہوا تازہ تازہ گھناؤنا چڑیا کا بچّہ ہے۔ غرض امّی ہماری ناک کی صفائی بڑی بے دردی سے فرمایا کرتی تھیں۔ اِدھر جب ہم جوان ہوئے اور جوان بھی کیا بیوی بچے والے ہوئے اور اپنے بچّوں کی ناکیں صاف ہوتی دیکھیں تو ہمیں اپنے بچّوں پر بڑا رشک آیا۔ ایک ہم تھے کہ ناک صاف کرنے کے نام سے کانپ اُٹھتے تھے ایک ہمارے بچے ہیں کہ اپنی امّی کو پُکار پُکار کر کہہ رہے ہیں، بلکہ خود اُن کی طرف بھاگے جا رہے ہیں کہ وہ ناک صاف کر دیں۔ ایک روز تو ہمارے دِل میں یہ نامعقول خیال بھی آیا کہ ہماری بیوی چوتھائی صدی پہلے کیوں نہ پیدا ہوگئی۔ امّی کے بجائے یہ ہماری ناک صاف کرتی تو اِس میں اللہ میاں کا کیا بگڑ جاتا۔ پھر ہمیں خیال آیا اِس میں اتنا رشک کرنے اور جلنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر آج بھی تو کبھی کبھی ہماری ناک آتی ہے، کیوں نہ اِس دفعہ بیوی سے ناک صاف کرائی جائے ــــ لہٰذا ہم انتظار کرنے لگے کہ کِس دن ہمیں نزلہ زکام ہوتا ہے اور کِس دن ہم اپنی یہ خواہش پُوری ہوتے دیکھتے ہیں۔

آخر ایک دن ہمیں مسلسل چھ سات چھینکیں آئیں اور اس کے بعد ہماری ناک چلنے لگی۔ ہم فوراً اپنی ناک لے کر بیوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، بلکہ یوں کہیئے کہ ہم نے اپنی ناک اُن کی خدمت میں پیش کر دی۔ بیوی کہنے لگیں: "یہ کیا مذاق ہے ؟"

"مذاق نہیں، جی چاہتا ہے کہ آج آپ ہماری ناک صاف کریں۔"

"چھی ... چھی ... چھی ... کیا فضول باتیں کر رہے ہیں۔"

لیکن جب بیوی نے دیکھا کہ ہم اپنی ضد سے باز نہ آئیں گے تو اُس نے ہماری ہی جیب میں سے رومال نکال کر ہماری ناک صاف کر ڈالی، لیکن ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہم نے جھلا کر پوچھا۔ "کیا بچوں کی ناک اِسی طرح صاف کرتی ہو؟"

کہنے لگی: "یہ بچوں کی ناک نہیں، بچوں کے ابا کی ناک ہے اور اُس کے صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے۔"

ہم اپنا سا مُنہ لے کر واپس ہوئے۔ اُس دن ہمیں اپنی ماں بہت یاد آئی۔

ناک کی بات ہماری ناک کی طرح کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی ہے، ورنہ بچوں کی تربیت کے ضمن میں ہماری امّی کا نظریہ یہی تھا کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ سے ___ سونے کا نوالہ ہمیں یاد نہیں رہا، کیونکہ انسان ازلی طور پر ناشکرا واقع ہوا ہے، البتہ شیر کی نگاہ یاد رہ گئی ہے۔ ویسے شیر کی نگاہ کے بارے میں بھی سُن لیجئے۔ ہمیں آج تک ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ہم تنہا یا چند دوستوں کے ساتھ جنگل میں جا رہے ہوں اور ہماری ملاقات کسی شیر کے ساتھ ہو گئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے آج تک ہمیں کسی شیر سے آنکھ لڑانے کا سنہری موقعہ میسّر نہیں آیا۔ ہاں یہ مانتے ہیں کہ ہم نے چڑیا گھر میں یا سرکس کے پنجرے میں شیر کو ضرور دیکھا ہے اور اُس سے آنکھیں بھی لڑائی ہیں۔ یقین کیجئے، ہمیں پنجرے کے شیر سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ اس سے زیادہ تو ہم اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ چلتی پھرتی بلّی سے ڈرتے رہے ہیں، بلکہ آج بھی ڈر جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ ہماری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ فرمائیں کہ شیر کی نسبت بلّی سے ڈرنا حق ہے کیونکہ یہ شیر کی خالہ ہوتی ہے، لیکن ہم نہایت ایمانداری سے یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ہم بلّی سے شیر کی خالہ ہونے کے باعث ہرگز نہیں ڈرتے، بلکہ ہمارے ڈرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ

بقول شخصے آزاد بلی پنجرے کے شیر سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ لفظِ خطرناک میں چونکہ ناک موجود ہے اِس لئے ہمیں ناک کے حوالے سے پھر ایک بات یاد آگئی۔ ہم مشکل سے پانچ سال کے ہوں گے۔ ایک دن امّی کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہے تھے کہ شیر نظر آگیا۔ ہم شیر کے قریب پہنچے تو غالباً اُس وقت شیر صاحب نزلہ زکام میں مبتلا تھے۔ اُن کی ناک بُری طرح چل رہی تھی۔ ہمیں شیر صاحب کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں ہم نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کر شیر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا "لو شیر بھیا! اس رومال سے اپنی ناک پونچھ لو"۔ ہم اپنا یہ جُملہ مکمل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ یکایک امّی نے ڈانٹ پلائی۔ امّی کی طرف دیکھا تو ہمیں واقعی اُن کی نگاہ شیر کی نگاہ سے زیادہ خوفناک نظر آئی اور ہم نے اپنا رومال واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے شیر کی نگاہ سے مُراد امّی کی نگاہ ہے۔ شیر کی نگاہ کو تو ہم نے کبھی بلّی کی نگاہ جتنی بھی اہمیت نہیں دی۔

ہفتہ میں چھٹی کا دن ہمارے لئے عموماً ظلم و ستم کا دِن ہوتا تھا۔ سب سے پہلے ہمارے سَر میں کنگھی کی جاتی تھی اور یہ کنگھی کیا ہوتی تھی، یوں لگتا تھا جیسے ہمارے سَر پر ہل چل رہا ہے۔ امّی اِس زور سے ہاتھ دبا کر کنگھی کرتی تھیں کہ ہماری کھوپڑی پر اُس کے دندانوں کے نشان بالکل اِس طرح پڑ جاتے تھے جس طرح کھیت میں ہل چلتے وقت زمین کے اُدھڑنے سے نشان پڑ جاتے ہیں۔ ہم ہائے ہائے کرتے جاتے اور امّی کنگھی کرتی جاتیں۔ اگر اِس ہائے ہائے میں ذرا شدّت پیدا ہو جاتی، تو تڑاخ سے ہمارے سَر پر ایک چپت آکر پڑتا اور اس کے ساتھ ہی خاموش رہنے کا حکم۔ ہم خاموش ضرور ہو جاتے لیکن ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے ہم خاموش نہیں ہوئے، بلکہ قتل ہو گئے ہیں — کنگھی سے فراغت حاصل ہوتی تو پھر ہمارے بدن پر مالش کی باری آتی۔ مالش میں اگرچہ ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوتی تھی، لیکن خدا جانے کیا بات تھی۔ مالش کراتے وقت ہمارے تمام جسم میں گُدگُدی اُٹھتی تھی جس کے باعث ہم اپنی جگہ پر قائم نہ رہتے۔ مثلاً امّی ہماری پنڈلیوں پر یا رانوں پر مالش کر رہی ہیں اور ہم ہیں کہ گُدگُدی کے مارے ناچ رہے ہیں، یعنی پاؤں پیٹ رہے ہیں۔ امّی کو ہماری یہ ادا یا ہمارا یہ کتھک ناچ بالکل پسند نہ آتا اور یوں ہماری مرمّت ہو جاتی۔ مالش کے بعد ہمارے کانوں میں سرسوں کا تیل ڈالا جاتا۔ اگرچہ

تیل ڈالنے سے بھی ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی، مگر ہمیں یہ کام بھی کوئی خاص اچھا نہ لگتا تھا بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ اس کام سے ایک طرح ہمیں نفرت سی تھی۔ ہم پہلے ایک کروٹ لیٹتے امی ہمارے کان میں تیل ڈالتیں۔ تیل ڈالنے کے بعد ہمارے کان پر ہتھیلی رکھ کر اُسے یعنی اپنے ہاتھ کو ہلاتیں اس طرح ہمارے کان سے کچھ عجیب قسم کی چیچ چیچ کی آوازیں بلند ہوتیں جو ہمارے لئے خاص تکلیف یا گھن کا باعث ہوتی تھیں۔ امی کا خیال تھا کانوں میں تیل ڈالنے سے ذوقِ سماعت ایک خاص انداز میں پرورش پاتا ہے۔ ایک دفعہ ابّو نے جو امی کو اس طرح ہمارے کان میں تیل ڈالتے دیکھا تو فراق کا یہ شعر پڑھا ؎

دل کی دھڑکن دے نہ سُنائی
اتنا کان میں تیل نہ ڈال

اُس وقت ہمیں اس شعر کا کچھ مطلب سمجھ میں نہ آیا، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ امی نے ابّو کو جواباً کہا تھا "آپ شعر پڑھتے ہیں میں کام کرتی ہوں"۔

اور کان میں تیل ڈالنے کے بعد ہمارے نہانے کی باری آتی تھی۔ یا اللہ توبہ ہمارا نہانا کیا ہوتا تھا بس کچھ نہ پوچھئے یوں لگتا تھا جیسے ہم واقعی قتل گاہ میں لیجائے جا رہے ہیں۔ ہمارے جسم کے ایک ایک حِصّے کو اِس طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا جاتا تھا گویا ہماری کھال ہی کھینچ لی گئی ہے۔ ہم اپنی کھال کھچوانے سے شاید اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا کہ ہمیں اپنا سَر دُھلوانے سے خوف آتا تھا۔ پہلا مرحلہ تو بالوں میں امی کا صابن لگانا اور ہمارا اپنی آنکھوں کو بند کرنے کا ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ صابن ہماری آنکھوں میں گھُس آتا اور آپ جانتے ہیں آنکھوں میں صابن گھُس آئے تو اُن میں کس طرح مرچیں سی لگتی ہیں۔ اِدھر ہم روتے اور اُدھر امی ہماری کمر میں مُکّہ رسید کرتیں۔ امی اپنی جگہ صحیح ہوتیں کیونکہ وہ صابن لگانے سے پہلے ہمیں خبردار کرتی تھیں کہ دیکھو میں صابن لگا رہی ہوں تم اپنی آنکھیں اچھی طرح بند کرلو۔ ہم آنکھیں اچھی طرح بند کیا کرتے تھے۔ یوں سمجھئے جتنا آنکھوں کو زور سے بھینچتے تھے اتنا ہی اُن میں صابن گھُس آتا تھا۔ ہماری سمجھ میں یہ راز ابھی تک نہیں آیا کہ آنکھیں بند کر لینے کے باوجود صابن آنکھوں میں کس طرح گھُس آتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آنکھیں بند کر لینے سے ہمیں یوں لگتا جیسے ہم تاریکی میں اُتر گئے ہیں اور

جب اندھیرے سے دَم گھُٹتا تو سانس لینے کے لیے مُنہ کھولنے کے بجائے آنکھیں کھول دیتے۔ امّی اکثر پُوچھتی تھیں "ارے تجھے آنکھیں بند کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا؟"

"جی امّی"

"کیوں؟"

"آنکھیں بند کرتا ہوں تو دَم گھُٹنے لگتا ہے"

"دم گھُٹنے لگتا ہے تو مُنہ کھولا کر، آنکھیں کیوں کھولتا ہے؟" ہم جواب دیتے "سانس لینے کے لیے۔" اور ہمارے اِس جواب پر کبھی کبھی تو امّی ہنس دیتیں، ورنہ اکثر یہ کہتے ہوئے ایک تھپڑ رسید کیا کرتی تھیں "اللہ نے ہمیں بھی عجیب لڑکا دیا ہے۔ مُنہ کے بجائے آنکھوں سے سانس لیتا ہے۔"

سچ پُوچھئے تو شادی بیاہ میں شریک ہونے کا صحیح لُطف بچپن یا لڑکپن ہی میں آتا ہے۔ جوانی یا بڑھاپے میں تو آدمی کسی کی شادی میں شریک ہوتا ہے تو اسی حسد میں جلتا رہتا ہے کہ اس شخص کی شادی کیوں ہو رہی ہے میری کیوں نہیں ہو رہی۔ ہاں تو جناب چھوٹی عمر میں جب ہمیں کسی شادی بیاہ کا پتہ چلتا تو بہت خوش ہوتے۔ عام طور پر امّی کے ساتھ ہی جانا ہوتا۔ ابّو تو باہر مردانہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ شریکِ محفل رہتے۔ اِدھر امّی کا حُکم ہوتا کہ ایک تو ہم اُن کی نظروں سے اوجھل نہ ہوں، کھیلنا ہے تو سامنے کھیلیں، جو کچھ دیکھنا ہے تو وہ بھی اُن کے سامنے دیکھیں، دوسرے بھُوک لگے تو کھانے کو ہرگز نہ مانگیں۔ کسی شادی میں شرکت کے وقت شروع شروع میں تو ہمیں کچھ پتہ نہ چلتا، لیکن ہمارے معاشرے میں کچھ ایسا فضول سا رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر مردوں کو پہلے کھانا کھلایا جاتا ہے اور خواتین کو بعد میں — حالانکہ ہونا چاہیئے اس کے برعکس، کیونکہ خواتین اوّل کے اُصول سے قطعِ نظر بچے اُن کے ساتھ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بچّوں کو جلدی بھُوک لگ جاتی ہے۔ بہرحال اب حالات قدرے درُست ہونے لگے ہیں، ورنہ ہمارے بچپن کے زمانے میں خواتین کو دوپہر کا کھانا تین بجے سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ ہم بارہ ایک بجے تک تو کھیلتے رہتے، لیکن جہاں ایک سے اُوپر وقت ہوا اور ہمارے پیٹ میں چُوہوں کے بجائے بھُوک کے دیو دوڑنا شروع

ہو جاتے۔ ہم ان دیوؤں کو اپنی بساط کے مطابق بہت سمجھاتے، لیکن یہ نامعقول ہماری کب ماننے والے تھے آخر ہم ہتھیار ڈال دیتے اور امی کے قریب آ کر کہتے "امی بھوک" اور امی ہمیں آنکھیں نکال کر دیکھتیں۔ ہم دوبارہ وہی الفاظ دہراتے تو اُن کی جانب سے ایک زوردار قسم کی "ہوں" ہوتی۔ ہم اس "ہوں" پر بھی چُپ نہ ہوتے، تو امی ہمارے پیٹ میں اس زور سے چٹکی لیتیں کہ ہم تڑپ کر رہ جاتے۔ غرض جب تک ہمیں کھانا میسر آتا ہمارا پیٹ امی کی متعدد چٹکیوں سے سُوج کر خاصا بڑا ہو جاتا تھا۔ امی کا خیال تھا بچوں میں صبر و ضبط کی عادت ابتدا سے ڈالنی چاہیئے۔

ہماری کسی غلطی پر امی کا ہمیں ڈرانے کا انداز بھی بڑا خطرناک ہوتا تھا۔ جہاں ہم سے کوئی ذرا SERIOUS قسم کی خطا سرزد ہوئی اور امی نے فوراً اعلان کیا "ارے کم بخت ابھی زمین پھٹے گی اور تو اس میں غرق ہو جائے گا"۔ اِدھر ہم یہ اعلان سُنتے اور اُچھل کر پاس پڑے ہوئے پلنگ پر چڑھ جاتے یا دیوار میں لگی ہوئی کسی کھونٹی سے لٹک جاتے۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز قریب نہ ہوتی اور اِن کے بجائے کوئی آدمی ہوتا تو اس کی کمر پر سوار ہو جاتے۔ ہمارا کھونٹی سے لٹکنا یا اُچھل کر پلنگ پر جا بیٹھنا ایسا خطرناک فعل نہ تھا، لیکن قریب کھڑے ہوئے آدمی کی کمر پر سوار ہو جانا خاصا قابلِ اعتراض فعل قرار دیا جا سکتا تھا اور کبھی کبھی تو ہماری یہ حرکت بہت ہی عجیب صورتِ حال پیدا کر دیتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ سکول میں عربی کے مولوی صاحب قیامت کی آمد کے بارے میں کلاس کو کچھ بتا رہے تھے جیسے ہی موصوف نے زمین کے پھٹنے کا ذکر کیا ہم اُچھل کر موصوف کی کمر پر سوار ہو گئے، چونکہ ہم ایک نہایت سعادت مند طالب علم شمار ہوتے تھے، اس لئے پہلے تو بے چارے مولوی صاحب کی سمجھ ہی میں کچھ نہ آیا کہ ہم اُن کی کمر پر کیوں سوار ہو گئے ہیں، لیکن جب ہم کسی صورت اُن کی کمر سے اُترنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو موصوف کو ہماری کمر پر اُلٹے ہاتھ سے ڈنڈے برسانے پڑے اور اس کے نتیجے میں کئی بار مولوی صاحب کا ڈنڈا خود اُن کی کمر پر بھی پڑتا رہا۔ ایک دفعہ تو مولوی صاحب نے غصے میں آ کر ہمارے سر پر ڈنڈا مارنا چاہا، لیکن وہ بھی مولوی صاحب کے سر پر پڑ گیا۔ بس پھر کیا تھا اس کے بعد تو ہماری اچھی طرح خبر لی گئی۔

امی کا خیال تھا، اولاد خواہ کیسے ہی اہم کام میں مصروف کیوں نہ ہو اگر اُسے والدین کا کوئی حکم مل گیا ہے تو اُسے چاہیئے سب کام چھوڑ کر اُس حکم کی تعمیل میں لگ جائے، چنانچہ ہم لوگ گھر میں ہوتے تو امی کے احکامات کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ رہتے تھے، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم پڑھنے میں مصروف ہیں اور امی نے کوئی حکم صادر فرما دیا۔ ظاہر ہے کہ پڑھتے وقت وہ حکم ہم کیسے سُن سکتے تھے۔ اِدھر امی ہیں کہ دوبارہ وہ حکم صادر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم پڑھنے کا عذر پیش کرتے تو فرماتیں "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماں باپ سے بڑھ کر تم کتابوں کو اہمیت دیتے ہو"۔ غرض بڑی مشکل پیش آتی۔ ایسے وقت میں چھوٹے بھائی کا لااُبالی پن اور مزاح ہمارے بہت کام آتا۔ ہم پُوچھتے پُوچھتے تھک جاتے اور امی نہ بتاتیں تو اظفر کہتا "بھائی جان! امی اِس لئے نہیں بتا رہی ہیں کہ کوئی فضول سا کام ہوگا جو انہیں یاد آگیا ہوگا"۔ اور امی گرج کر کہتیں "کیسا فضول کام"؟

"یہی کہ آپ اس وقت حُقّہ پینا چاہتی ہوں گی"۔

"لاحول ولاقوۃ ارے نالائق مجھے تُو نے حُقّہ پیتے کب دیکھا ہے"۔

"حُقّہ پیتے تو کبھی نہیں دیکھا لیکن ممکن ہے آپ ہم سے چُھپ کر یہ شغل فرماتی ہوں"۔

"تجھ پر خدا کی سنوار، میرے بارے میں تُو نے یہ کیسے سوچ لیا"؟

"اگر یہ بات نہیں تو پھر بھائی جان کو بتا دیجئے نا آپ نے کیا کام کرنے کو کہا تھا"؟

اس پر امی ہمیں وہ کام بتا دیتیں۔

ہم پر امی کی ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ بچپن یا لڑکپن ہی تک جاری نہیں رہا۔ بفضلِ الٰہ شادی کے بعد تک بلکہ بچے ہونے کے بعد تک ہم نے امی سے نہ صرف ڈانٹ کھائی ہے، بلکہ پٹے بھی ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ ماں باپ سے پٹنے میں جو مزہ بڑے ہو کر آتا ہے، بچپن یا لڑکپن میں تو اُس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ آپ کے بیوی بچے دیکھ رہے ہیں اور آپ کی امی آپ کے کان کھینچ رہی ہیں۔ سچ سچ بتائیے اس سے زیادہ خوبصورت اور پُرکیف منظر آپ کی نگاہِ تصوّر میں کوئی ہو سکتا ہے ۔۔۔ ممکن ہے آپ اِس منظر کا تصوّر کرتے ہوئے شرما رہے ہوں تو جناب! ہم سے سُن لیجئے۔ ہم نے نہ صرف یہ منظر دیکھا ہے بلکہ ہم کئی بار اس منظر

سے ہو کر گذرے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو ہم باہر سے آئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ امّی کا مُنہ پھُولا ہوا ہے اور بیگم بھی تیوری چڑھائے بیٹھی ہیں۔ ہمیں ایک دم غصّہ آگیا: "یہ کیا مصیبت ہے ایک تو باہر سے دھکّے کھاتے آؤ، گھر میں پہنچو تو ماں بیوی سب کے مُنہ پھُولے ہوئے ہیں۔" ہمارا یہ کہنا تھا کہ امّی فوراً بلند آواز میں بولیں: "ارے لڑکے یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تُو نے بیوی اور ماں کو ایک درجہ پر سمجھ لیا ہے۔ مجھے یہ اندازِ گفتگو ہرگز پسند نہیں۔" اس پر ہم نے جو ایک دو فقرے مزید کہہ دیئے تو امّی یکایک ہمارے قریب آکر بولیں: "کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ ایک بیوی کا شوہر بن گیا ہے اور تیرے ایک لڑکی پیدا ہوگئی ہے تو مَیں تجھے سزا نہیں دے سکتی؟"

"نہیں امّی مَیں نے ایسا ہرگز نہیں سمجھا۔"

امّی نے ہمارا کان پکڑتے ہوئے کہا: "نہیں تو کچھ ایسا ہی سمجھنے لگا ہے جبھی تو گھر میں فوں فاں کرتا ہوا آتا ہے۔" جس وقت امّی ہمارا کان پکڑ رہی تھیں اُس وقت ہماری ۲½ سالہ بیٹی یہ منظر دیکھ کر ہنس رہی تھی اس پر ہمیں بھی ہنسی آگئی۔ امّی نے سمجھا ہم اُن کے کان پکڑنے پر ہنس رہے ہیں؛ چنانچہ اُنہیں مزید غصّہ آگیا اور موصوفہ نے ہمارے شانوں پر دو تین تھپڑ لگائے لیکن ہمارے شانوں پر ہڈیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا جس کے باعث ہمارا تو کیا بگڑنا تھا امّی کے ہاتھوں کو اُلٹی تکلیف پہنچی۔ ہم نے اُن کے ہاتھوں کو چُومنا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر امّی نے ہمیں اپنے گلے سے لگا لیا اور بہت دیر تک روتی رہیں۔ اُن کو یہ شکایت تھی اور بجا شکایت تھی کہ میں اپنی بیوی کے سامنے ہی اُن کی غلطی کو ظاہر کر دیتا ہوں۔ وہ اکثر فرمایا کرتیں: "بیٹا! مَیں اپنے آپ کو فرشتہ نہیں سمجھتی، مجھ سے غلطی کا سرزد ہونا لازمی ہے، لیکن تمہارا یہ فرض ہے تم میری غلطی کو مجھ سے علحدگی میں بتا دیا کرو۔" اِدھر ہمارا یہ حال تھا کہ موقع پر تو ہمیں کچھ یاد بھی رہتا تھا بعد میں ہم تمام واقعہ بھُول جاتے تھے اور جب رات کو ابّا جان کی عدالت میں ہمارا مقدمہ پیش ہوتا تو اکثر غلطی ہماری اور ہماری بیوی ہی کی ثابت ہوتی؛ لہٰذا ہم دونوں نہایت شرمسار اُٹھتے لیکن ابّا جان امّی کی طبیعت کو سمجھتے تھے اُنہیں ہمارے بھُلکّڑ ہونے کا بھی علم تھا اس لئے موصوف اکثر ہمارے حق میں فیصلہ صادر فرماتے جس پر امّی کو پھر غصّہ آجاتا۔ کبھی کبھی ابّا جان اپنے خاص مزاحیہ انداز

میں پہلے سے یہ اعلان بھی فرما دیا کرتے: "عزیزم آج تم خواہ کتنا زور لگاؤ میں فیصلہ اپنی بیوی کے حق میں دوں گا۔" امّی اِس پر بھی ناراض ہو جاتیں اور فرماتیں: "اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرے حق میں فیصلہ جانب داری کی بنا پر کیا جا رہا ہے، انصاف کی بنا پر نہیں: چنانچہ میں اِس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہوں۔" ابّا جان تحکمانہ انداز میں فرماتے: "دیکھو بیگم یہ تم توہینِ عدالت کر رہی ہو۔" مگر ایک دفعہ امّی کو بھرپور غصّہ آجائے، پھر اُس کو سنبھالنے والا کون ہو سکتا تھا۔ خود عدالت کو امّی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔

اب تک میں نے آپ کو شیر کی نگاہ سے متعلق باتیں بتائی ہیں اب ذرا ایک دو جُملے سونے کے نوالے سے متعلق بھی سُن لیجئے۔ اِس تمام ڈانٹ ڈپٹ اور سختی کے باوجود ہمیں چھینک بھی آجاتی تھی تو امّی کا کھانا پینا حرام ہو جاتا تھا۔ فوراً ڈاکٹر کے لے جایا جاتا۔ قرآن پاک کی سورتیں دَم کر کے پھُونکی جاتیں، مَنّتیں مانی جاتیں، صدقہ اتارا جاتا۔ غرض ہمارے ذرا سے بیمار پڑنے پر کیا کیا جتن نہ کئے جاتے تھے۔ اِسی طرح اگر ہمیں سکول یا بازار سے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی، امّی بے قرار ہو کر دروازہ پر آجاتیں۔ کہیں ملازم کو دوڑایا جا رہا ہے، کہیں محلّے کے لڑکے بالوں کو ہماری تلاش میں بھیجا جا رہا ہے۔ راہ چلنے والوں کو ہمارا حُلیہ بتا کر سمجھایا جا رہا ہے کہ جہاں کہیں اِس شکل وصورت کا لڑکا نظر آئے اُسے فوراً تاکید کی جائے کہ سیدھا گھر پہنچے اُس کی امّی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

آخری بات بھی سُن لیجئے۔ میں ۲۶ر اگست ۱۹۴۷ء کی شام کو منڈی ڈبوالی سے بچ بچا کر حصار مشرقی پنجاب امّی کے پاس پہنچا۔ میرے ساتھ دو کے اعزّا بھی تھے۔ ۲۷ر اگست کو ٹوہانہ ضلع حصار سے میری خالہ اور خالو بھی آ گئے تھے۔ اس طرح ہمارے گھر میں چالیس افراد کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ اِن سب کے لئے کھانے پکانے کا انتظام کرنا تھا اُن کا ویسے بھی خیال رکھنا تھا، لیکن اس تمام مصروفیت کے باوجود امّی نے ۲۶ اور ۲۷ر کی دونوں راتیں میرے سرہانے تسبیح پڑھ کر گذاریں۔ جس وقت بھی میری آنکھ کھُلتی میں امّی کو تسبیح پڑھتے اور دعائیں مانگتے دیکھتا۔ میں نے ایک دو دفعہ اُٹھ کر کہا بھی کہ "خدا کے لئے امّی آپ دِن بھر کی تھکی ہوئی ہیں، لیکن پھر بھی میرے سرہانے دعائیں مانگ کر اور قرآن پڑھ کر آنکھوں میں رات بسر کرتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کرلیں" لیکن امی کو روکنے والا کون ہوسکتا تھا۔ اور۔۔۔ اور ۔۔۔۔ ۲۹ راگست کی صبح طلوع ہوئی تو۔۔۔ یہ صُبح ۔۔۔ یہ صُبح ۔۔۔ میری ماں کے لئے آخری صُبح تھی۔ اسی روز شام کو اپنے دوسرے پیاروں کے ساتھ میری پیاری ماں شہید کر دی گئی اور اگر آپ نے میری کتاب "آزادی کے چراغ" پڑھی ہے تو اُس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میری ماں کی یہ شہادت بھی اسی ممتا کے جذبہ سے سرشار ہوکر وقوع میں آئی۔ یعنی جیسے ہی میرا چھوٹا بھائی اظفر گھر سے باہر نکلا ہے اور اُس پر دشمنوں نے حملہ کیا۔ بس گولی کی آواز سُنتے ہی میری ماں پاگلوں کی طرح نکل کھڑی ہوئی" ہائے میرے کڑیل جوان بیٹے کو مار ڈالا۔" اور امی کے باہر آتے ہی ظالموں نے اُن کے کلیجے میں بلّم مار کر انہیں ہلاک کردیا۔ سوچتا ہوں امی نے اپنی زندگی کی آخری دو راتیں میرے سرہانے میری زندگی کی دُعائیں مانگتے بسر کیں اور اپنی زندگی کا آخری دن میرے چھوٹے بھائی پر قربان کر ڈالا۔ غالباً میری ماں کو خیال آیا ہوگا کہ "چھوٹا بیٹا کیا کہے گا بڑے بھائی کا امی کو اتنا خیال ہے اور میرا خیال کچھ بھی نہیں۔ ٹھیک ہے ایک بیٹے کے لئے راتیں آنکھوں میں گزاریں، دوسرے کے لئے جگمگاتے دن کا نذرانہ لے کر کیوں نہ چلوں جس میں آزادی کی اُمنگوں سے بھرپور لہو کی تمازتیں اُمڈ رہی ہیں"۔ زندگی سے بڑھ کر سونے کا نوالہ اور کونسا ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ امی کی شیر کی نگاہ کے پیچھے بھی دراصل یہی زندگی کو نظم وضبط سے گذارنے کی آرزو کارفرما تھی ۔۔ وہ چاہتی تھیں اُن کی اولاد زندگی کے ہر چیلنج کو مردانہ وار قبول کرے۔ اب یہ اولاد کی اپنی ہمت اور حوصلے پر منحصر ہے کہ اُس نے ماں کی اس تمنا کو کس حد تک پُورا کیا۔ ویسے میں فی الحال اپنی ماں سے شرمسار ہوں

بال سے باریک

شرافت میرا بہت ہی وضعدار قسم کا دوست ہے۔ اس نے یہ اصول بنا رکھا ہے کہ میں اسے پوچھنے جاؤں یا نہ جاؤں، وہ ایک دن چھوڑ کر میرے گھر ضرور آتا ہے، لیکن اس دفعہ پورے دو ہفتے گزر گئے، وہ نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے کوئی خیال ہی نہ کیا، مگر جب پچھلے جمعے اس نے دوستوں کی ایک محفل میں بھی شرکت نہ کی، تو مجھے احساس ہوا ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے؛ چنانچہ میں پرسوں چھٹی کے دن خاص طور سے پروگرام بنا کر اس کے گھر پہنچا۔ جیسے ہی میں دروازے میں داخل ہوا، وہ گھر سے نکل رہا تھا۔ میں نے خیریت پوچھی، تو کہنے لگا: "الحمدللہ، سب خیریت ہے، مگر . . . . ."

"مگر کیا؟"

"وہ آئے ہوئے ہیں۔"

"وہ کون؟"

"میں جلدی میں ہوں، ان کا نام نہیں لے سکتا۔ تم اندر چلو، شگفتہ تمہیں سب کچھ بتا دیگی۔"

"میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا، تو اتفاق سے شرافت کی بیوی شگفتہ ہی نے دروازہ کھولا۔ کہنے لگی: "آیئے بھائی جان! آج صبح سے غالباً اسی لیے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے کہ آپ تشریف لانے والے تھے۔"

میں نے کہا: "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس فرصت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ آج تو خاص طور پر اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ شرافت پورے دو ہفتے سے ملنے نہیں آئے تھے۔"

"جی ہاں، ان کے والدِ مکرم و محترم و محتشم تشریف لائے ہوئے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟ بڑی باادب ہوکر تکلف سے بات کر رہی ہیں آپ"۔

"بس کچھ نہ پوچھیئے"۔

"کیوں؟"

"ان کا حکم ہے کہ ابا جان کا ذکر نہایت ادب سے کیا جائے۔ میں نے تو صرف مکرم و محترم و محتشم ہی کہا ہے اور وہ بھی ان کی غیر حاضری میں۔ اگر وہ خود نام لیتے، تو نہ معلوم کتنے ادب کے الفاظ استعمال کرتے"۔

مَیں نے قدرے مسکرا کر کہا: "اوہو، غالباً اسی لئے شرافت نے جلدی کی وجہ سے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کون آیا ہے۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ وہ آئے ہیں"۔

"جی ہاں . . . جی ہاں . . . اپنے والد صاحب کے احترام کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی محتاط واقع ہوئے ہیں"۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے"۔ میرے یہ الفاظ سُن کر شگفتہ کے چہرے کے ردِّ عمل سے کچھ یوں ظاہر ہوا جیسے میں نے کوئی عقلمندی کی بات نہیں کی۔ بہر حال شگفتہ نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور میں وہاں بیٹھ گیا۔

"شرافت کب تک آئیں گے؟" مَیں نے پُوچھا۔

"وہ تو ذرا دیر ہی میں آئیں گے۔ اپنے افسر کے پاس گئے ہیں"۔

"والد صاحب قبلہ کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہیں"۔

"سو تو نہیں رہے"؟

"جی نہیں، ان کے سونے کا تو یہ وقت نہیں ہے"۔

"کیا مَیں ان سے مِل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں . . . . مگر . . . ."

"مگر کیا؟"

"ذرا احتیاط سے ملئے"۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا خدا نخواستہ وہ علیل ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"کچھ دماغ نہیں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔ دماغ۔۔۔"

"دماغی اعتبار سے بھی وہ ماشاء اللہ بہت صحت مند ہیں۔"

"کیا تھکے ہوئے ہیں؟"

"یہ بات بھی نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، شرافت ان کا بہت احترام کرتے ہیں، آپ بھی۔۔۔"

"یعنی کیا مطلب بھابی صاحبہ! آپ سمجھتی ہیں مجھے بزرگوں سے ملنا نہیں آتا خدانخواستہ میں بدتمیز ہوں؟"

"ارے بھیا! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بس یہی کہنا چاہتی تھی کہ۔۔۔"

"ان کا خیال رکھا جائے۔" میں نے جملہ پورا کیا اور شرافت کے والد سے ملنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ شگفتہ نے مجھے روک کر کہا "بھائی جان! ذرا ٹھہریئے۔ میں قبلہ گاہی کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں۔" یہ کہہ کر اُس نے نہایت احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر اسی احتیاط سے بند کیا، مگر اسی دوران میں کمرے کے اندر جو میری نظر پڑی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگوار اُچھل کر دھڑام سے بستر پر اس طرح سیدھے دراز ہو گئے جیسے کوئی جنازہ پڑا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا؛ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ یہ صاحب شگفتہ کے کمرے میں آنے سے قبل غالباً فرش پر ٹہل رہے تھے، اسے آتا دیکھ کر بذریعہ چھلانگ بڑی پھرتی سے مسہری پر جا لیٹے ہیں۔ غالباً دروازہ بند کرنے میں زیادہ احتیاط برتنے کی وجہ سے وہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا جس میں سے میں نے یہ بھی دیکھا کہ شگفتہ بالکل سیدھے لیٹے ہوئے ان محترم کے مُنہ پر جُھکی اور پھر ان کے کان میں کوئی بات کہہ کر اُلٹے پاؤں واپس ہوئی۔ باہر آ کر مجھ سے بولی:

"اب آپ اندر جا سکتے ہیں۔ قبلہ گاہی مسہری پر دراز ہیں۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا: "دراز کیوں ہیں، خیریت تو ہے نا؟"

"بالکل خیریت سے ہیں۔ بس ذرا شرافت صاحب نے انہیں کہہ رکھا ہے کہ آرام کیا کریں۔ چل پھر کر ہمیں گناہ گار نہ کیا کریں۔"

"چلنے پھرنے سے گناہ گاری کا کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا: "شرافت کا خیال ہے کہ اگر باپ، بیٹے کے گھر آئے تو اُسے مسلسل آرام کرنا چاہیئے۔ چلنے پھرنے سے بیٹے کے سر گناہ ہوتا ہے کہ باپ کو اتنی سی تکلیف بھی کیوں دی گئی ـــــ اس لئے گزارش ہے کہ آپ بھی ....."

"بے فکر رہیئے، میں قبلہ گاہی کو زیادہ زحمت نہ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں کمرے میں داخل ہوا۔ مسہری کے قریب جا کر سلام عرض کیا، تو نہایت دھیمی آواز میں غالباً وعلیکم السلام کہا۔ میں نے خیریت پُوچھی، تو اس کا جواب بھی اتنی آہستگی سے دیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید موصوف اُونچا سُنتے ہیں؛ چنانچہ ذرا بلند آواز سے مزاج پُرسی کی۔ اس بار قبلہ گاہی نے اور بھی مدھم آواز نکالی۔ میں نے مزید بلند آواز سے کہا: "قبلہ! میں یہ پُوچھ رہا ہوں کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"برخوردار! میری مزاج پُرسی کر رہے ہو یا مجھے ڈانٹ رہے ہو؟" قدرے ناراض ہو کر اور قدرے بلند آواز میں بولے۔

"جی؟" مجھے حیرانی ہوئی۔

"عرض یہ ہے کہ میں بہرہ نہیں ہوں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں۔"

"معاف کر دیا۔" انہوں نے پھر آہستہ سے کہا۔

"شکریہ"۔ میں نے جواب دیا، لیکن میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بظاہر ایک صحت مند آدمی اس قدر آہستہ کیوں بول رہا ہے اور مسہری پر اس طرح کیوں دراز ہے جیسے کوئی جنازہ پڑا ہو۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ براہِ راست سوال کیا: "کیا آپ کمزوری محسوس کر رہے ہیں؟"

"نہیں"۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"کیا آپ کا گلا خراب ہے؟"

"نہیں"۔

"تو پھر آپ اتنی مدھم آواز میں کیوں بول رہے ہیں اور اس طرح بے حس و حرکت کیوں

پڑے ہیں؟" میرے اس سوال پر بزرگوار نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب ہو کا اشارہ کیا۔ میں قریب آیا اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں، تو قبلہ گاہی نے مجھے دیکھ کر فوراً آنکھ مار دی۔ میں سخت شرمندہ ہوا اور کھسیانا سا ہو کر کرسی سے پُشت لگا کر بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا آخر بڑے میاں کو آنکھ مارنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر مجھے خود ہی خیال آیا کہ بزرگوار نے آنکھ نہیں ماری، میں نے غلط اندازہ لگایا۔ وہ غالباً آنکھ جھپک رہے ہوں گے جسے میں نے آنکھ مارنا سمجھ لیا..... مگر...... مگر مجھے پھر خیال آیا، دوسری آنکھ موصوف نے اچھی طرح بند کی تھی اور یقیناً انہوں نے آنکھ ماری تھی۔ چلیے اگر آنکھ مار بھی لی، تو کونسا غضب ہو گیا۔ بزرگ تو ہاتھ بھی مار سکتے ہیں، لات بھی مار سکتے ہیں، آخر ان سے آنکھ مارنے کا حق کیوں چھینا جائے۔

میں ایسے ہی اُوٹ پٹانگ قسم کے خیالات میں محو بیٹھا تھا کہ شرافت کے والدِ محترم نے مجھے پھر ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے قریب ہونے کا اشارہ کیا۔ میں پھر قریب ہوا، تو موصوف نے نہایت دھیمی گویا رازدارانہ آواز میں کہا: "مجھے کھانسی آرہی ہے۔" ایک دفعہ تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کھانسی کی اطلاع دینے سے بزرگوار کا کیا مطلب ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی یہ خواہش ہو کہ ان کے بجائے میں کھانس لوں، مگر لاحول ولا قوۃ یہ میرا کیا لغو خیال ہے۔ دوسرے کے کھانس لینے سے اپنی کھانسی کی خواہش یا ضرورت کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ کھانسی تو خود کھانسنے ہی سے جاتی ہے۔ بہرحال میں نے ان سے عرض کیا: "جناب، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"ارے برخوردار، میرا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ کیا میں کھانس سکتا ہوں؟"

"ضرور کھانسیے۔"

"کتنی مرتبہ؟"

"جی؟"

"کیا میں پانچ چھ بار اچھی طرح یعنی زور زور سے کھانس سکتا ہوں؟" میں نے پوری طرح اثبات میں ابھی سر نہ ہلایا تھا کہ بزرگوار نے کھُل کر کھانسنا شروع کر دیا۔ کھانسنے کے بعد انہوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ دو چار مرتبہ جزاک اللہ، جزاک اللہ بھی کہا۔ اس کے بعد مجھے ہاتھ سے اپنے قریب آنے کا پھر اشارہ کیا۔ میں قریب

ہوا، تو اس دفعہ بزرگوار نے جھٹ سے پیچ کر کے میرے گال کا پیار لے لیا۔ توبہ... توبہ... یہ بزرگوار تو خاصے عاشق مزاج معلوم ہوتے ہیں لیکن مجھ ایسے سُوکھے سڑے شخص کے پچکے ہوئے گالوں پر پیار کرنے سے کسی کی عاشق مزاجی کو کیا تسکین ہو سکتی ہے.... میرا یہ خیال بھی غلط ہے۔ بزرگوار مجھ سے یقیناً عاشقی نہیں فرما رہے ہیں۔ "عاشقی نہیں تو پھر کیا فرما رہے ہیں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور میں اس کا کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے پھر رازدارانہ انداز میں مجھے اپنے قریب ہونے کے لئے اشارہ کیا۔ میں قریب ہوا، تو اسی دھیمی آواز میں کہنے لگے: "کیا میں ٹانگ اُٹھا سکتا ہوں؟"

"جی؟" میں پھر حیران سا ہو گیا۔

"میرا مطلب ہے کیا میں اپنی داہنی یا بائیں کوئی سی ٹانگ اُٹھا سکتا ہوں؟"

"اس میں پُوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" میرے اس سوال پر مزید رازدارانہ انداز میں آواز کو دھیمی کرتے ہوئے بولے: "جب شگفتہ کمرے سے باہر چلی جائے گی، پھر میں تمہیں اصل بات بتاؤں گا۔"

"لیکن شگفتہ تو اسی وقت واپس چلی گئی تھیں۔"

"کیا اس وقت کمرے میں میرے اور آپ کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں؟" بزرگوار نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پُوچھا۔ میں نے جواب دیا: "کوئی نہیں۔" یہ سُنتے ہی شرافت کے والد ایک دم بچوں کی طرح ٹانگیں چلانے لگے اور چند منٹ یہ ورزش کرنے کے بعد تکیے کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے بولے: "برخوردار! میری ان حرکتوں سے تم حیران تو ضرور ہو گئے، لیکن جب حقیقی صورتِ حال سے واقف ہو گے تو تمہاری یہ حیرانی فوراً دُور ہو جائے گی۔ اب اصل بات سنو! تعطیل کے باعث آج صبح سے شرافت گھر پر موجود تھے جس کی وجہ سے اُن کے دوست مسلسل آتے رہے۔ ہر دوست مزاج پُرسی کے لئے میرے پاس بھی آتا اور یوں مجھے صبح سے ایک منٹ کے لئے بھی آرام سے تنہا ہونے کا موقع نہ ملا۔ بس اسی طرح تختہ بنا پڑا ہوں۔ اب شرافت باہر گئے، تو میں نے سوچا کہ ذرا کمرے میں چہل قدمی کر کے مسلسل چت پڑے رہنے کی تھکن دُور کروں، لیکن ابھی کھڑے ہو کر دو قدم بھی نہیں چلنے پایا تھا کہ تم آ گئے اور مجھے پھر دھڑام سے مسہری پر لیٹنا پڑا۔"

"مگر ایسا سب کچھ کیوں ہو رہا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔

انہوں نے جواب دیا: "معلوم نہیں شرافت کو یہ کیا وہم ہو گیا ہے کہ باپ کو بیٹے کے گھر مکمل آرام کرنا چاہیئے۔ بس حرکت کرنا تو بڑی بات ہے، مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے یا بولنے کی بھی اجازت نہیں۔ ذرا کھانستا بھی ہوں، تو شرافت بھاگ کر میرے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے آپ نے کچھ کہا ہے۔ اب تم خود ہی خیال کرو آج کل مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی"۔

"واقعی آپ کی حالت قابلِ رحم ہے"۔

"مگر محض زبانی ہمدردی سے کیا حاصل ہ کوئی علاج بھی تو بتاؤ"۔

"آپ شرافت سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ آپ کو اس قدر احترام کی ضرورت نہیں"۔

"کئی دفعہ کہا"۔

"پھر"؟

"اس پر وہ بچوں کی طرح، بلکہ بوڑھوں کی طرح بھاں بھاں کر کے رونے لگتا ہے"۔

"صرف روتا ہی ہے یا روتے ہوئے کچھ کہتا بھی ہے"؟

"کیا مطلب"؟

"میرا مطلب ہے روتے وقت وہ بھاں بھاں یا جُھوں جُھوں ہی کئے جاتا ہے یا اس بھاں بھاں اور جُھوں جُھوں کے ساتھ کچھ الفاظ بھی ادا کرتا ہے"؟

"آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں"۔

"فرمایئے"۔

"میرا شرافت بھاں بھاں کر کے نہیں روتا"۔

"قبلہ آپ نے خود ہی فرمایا تھا"۔

"میں نے تو روزمرہ کے اعتبار سے کہہ دیا تھا۔ آپ نے حقیقت ہی سمجھ لیا اور اس میں بھاں بھاں کے ساتھ جُھوں جُھوں کا بھی اضافہ کر دیا"۔

"پھر شرافت کس طرح روتا ہے"؟

"روتا تو ایک عام آدمی کی طرح ہی ہے، لیکن بھاں بھاں کے بجائے کُوں کُوں کر کے روتا ہے"۔

"چلئے یونہی سہی، اب میرے سوال کا جواب عنایت فرمائیے کہ کُوں کُوں کرتے وقت کیا وہ کچھ کہتا بھی ہے؟"

"جی ہاں، کہتا ہے احترام نہیں کرنے دیتے، تو گن کر دس جُوتے ماریئے۔"

"پورے دس؟"

"لاحول ولا قوۃ میاں صاحبزادے! آپ زبان کے استعمال سے بالکل ناواقف نظر آتے ہیں۔ روزمرّہ میں یونہی ہے۔"

"پھر اس پر آپ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟"

"یعنی... مَیں نے...؟"

"جی ہاں، آپ نے۔"

"آپ کا خیال ہے مجھے شرافت کے جُوتے مار دینے چاہئیں؟"

"مَیں چاہیئے کی بات نہیں کر رہا ہوں، حقیقت پُوچھنا چاہتا ہوں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ مَیں کچھ نہیں کرتا، خاموش ہو جاتا ہوں۔"

"آپ بڑے حوصلے کے بزرگ ہیں۔"

"اتنا بھی حوصلے والا نہ سمجھو۔"

"کیوں؟"

"میاں، ایک دن مَیں نے غصّے میں آکر واقعی شرافت کے جُوتے لگا ڈالے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، وہ اس قدر سعادت مند واقع ہوا ہے کہ سر جُھکائے جوتے کھاتا رہا اور جب مَیں اپنا غصّہ ٹھنڈا کر چکا، تو خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔"

"آپ کو اُس رات تو بڑے مزے کی نیند آئی ہوگی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اُس رات مَیں تو ایک لمحے کو پلک نہ جھپک سکا۔ سخت رنج و ملال میں مبتلا رہا... مگر..."

"مگر کیا؟"

"صبح کو شرافت میرے کمرے میں آیا، تو بے حد خوش تھا۔ مَیں شرمندگی سے نگاہیں اُوپر

نہ اُٹھ رہا تھا کہ اس نے کہا: "ابا جان، رات مجھے خوب نیند آئی۔ کئی حوریں میری خدمت میں لگی رہیں۔ یہ سب آپ کے جوتوں کا صدقہ ہے۔ غالباً ہر جوتے کے عوض اللہ نے میری خدمت میں ایک حور بھیجی۔"

"ماشاءاللہ آپ کا شرافت بہت ہی نیک اور سعید فرزند ہے۔"

"لیکن عزیزِ من! فی الحال اس کی نیکی مجھے بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔" اور اس کے بعد شرافت کے والد نے مجھے شرافت کے احترام کی اور اپنی اُلجھن کی بہت سی باتیں بتائیں۔ کہنے لگے: "میاں! میں ایک رات کھانا کھانے کے بعد نہایت اچھے مُوڈ میں اپنے بستر پر آ کر دراز ہوا، تو سہگل کا ایک گانا کھرج میں گانے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ شرافت اپنے کمرے سے راستے کی چیزیں توڑتا پھوڑتا میرے پاس گھبرا کر آیا اور قریب قریب روتے ہوئے پوچھنے لگا: "میرے پیارے ابا جان! میں آپ پر قربان جاؤں۔ کیا آپ نے زیادہ کھانا کھا لیا۔ جس کی وجہ سے آپ کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟ یا خدانخواستہ آپ کے دل میں درد ہے، یا صرف سر میں درد ہے، یا کسی اور جگہ؟ پیارے ابا جان! پیارے ابا جان! جلدی بتایئے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔ اے اللہ! تو ابا جان کے بدلے میرے پیٹ میں درد کر دے، میرے دل میں درد کر دے، میرے سر میں درد کر دے۔ میرا مطلب ہے اللہ میاں! تو اچھی طرح جانتا ہے جہاں بھی ابا جان کے درد ہے وہاں میرے ہو جائے۔" اور میں نے شرافت کو بتایا کہ بھلے آدمی میرے کہیں بھی درد نہیں، بلکہ میں تو گانا گانے کی کوشش کر رہا تھا، تو معلوم ہے اس نے پھر کیا کیا؟"

"آپ ہی بتایئے۔"

"رونا دھونا چھوڑ گانا شروع کر دیا۔ آپ جانتے ہیں اس کی آواز نہایت بھدی ہے۔ گانے کی الف بے سے بھی واقف نہیں، مگر اس کے باوجود بہت دیر تک وہ آآ اور ہاہا کرتا رہا۔ کہتا تھا ابا جان جب تک سو نہیں جاتے، میں اسی طرح آپ کی خدمت میں گاتا رہوں گا۔ آخر جب میں نے دیکھا کہ برخوردار کسی طرح باز آنے والا نہیں، میں نے جھوٹ موٹ کے خراٹے مارنے شروع کر دیئے۔ جس وقت شرافت گا رہا تھا، اس کے بیوی بچوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا، مگر میرے صبر اور حوصلے کی داد دیجیے کہ میں نہایت سنجیدگی سے

نہ صرف شرافت کا گانا سُن رہا تھا، بلکہ جب وہ مجھے داد طلب نگاہوں سے دیکھتا، تو میں اس کے فن کی داد بھی دیتا تھا۔"

اس کے بعد کہنے لگے: "اگلے روز کی سُنیئے۔ مجھے ہر صبح اُٹھ کر تھوڑی سی ورزش کرنے کی عادت ہے؛ چنانچہ حسبِ معمول کھڑے ہو کر ابھی ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند ہی کیا تھا کہ شرافت پھر بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "ابا جان! آپ یہ کیا تکلف فرما رہے ہیں مجھے حکم دیجیے۔ اس کام کو یہ کمترین انجام دے لیتا ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"برخوردار! یہ کام نہیں، ورزش ہے۔"

بولا، "پھر کیا ہوا۔ اس میں آپ کو مشقت تو اُٹھانا پڑے گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔"

"تب تو میں آپ کو ہرگز اس تکلیف میں نہ پڑنے دوں گا۔" شرافت میرے ہزار سمجھانے پر بھی نہ مانا اور مجھ سے مسلسل اصرار کرتا رہا۔ جب اس نے مجھ سے یہ پُوچھا: "آخر آپ کیا ورزش کرتے ہیں؟" تو میں نے بھی غصّے میں آ کر کہہ دیا: "برخوردار! میں روزانہ چار سو بیٹھکیں لگاتا اور دو سو ڈنٹر پیلتا ہوں۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے یہ کہا اور بیٹھکیں لگانا شروع کر دیں۔ خدا خدا کر کے چار سو بیٹھکیں لگا چکا، تو پھر ڈنٹر پیلنے کے لئے تیار ہوا۔ اس کا سانس بُری طرح پھُول رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابُور تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس مُفت کی بیگار سے کس طرح نجات دلاؤں۔ ذرا رک کر بولے، "اور سُنیئے بعض وقت تو چھینک ایکدم آ جاتی ہے، لیکن کبھی کبھی آنے سے پہلے ناک میں عجیب قسم کی خارش، گُدگُدی کی صورت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے کچھ تو ناک کے نتھنے کشادہ ہو جاتے ہیں اور کچھ مُنہ کھُل جاتا ہے؛ چنانچہ مجھ پر ایک دن یہی کیفیت طاری تھی کہ شرافت نے گڑگڑا کر کہا: "اوہو ابا جان، آپ تکلّف نہ فرمائیں۔ جو حکم صادر کرنا چاہتے ہیں، بے تکلفی سے صادر فرمائیں، سوچنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" شرافت کے اس کہنے کی وجہ سے میری چھینک کا تمام لُطف زائل ہو گیا اور کھُل کر چھینکنے کے بجائے میں صرف آچھوں کر کے رہ گیا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ کم از کم ہماری مشرقی تہذیب میں چھینک پر ایسی کوئی خاص پابندی عائد نہیں، خاص طور پر اپنے گھر میں؛ چنانچہ عموماً ہم مشرق والوں کی طبیعت اُس وقت تک پوری طرح بحال نہیں ہوتی،

جب تک آزادی سے ناک اور منہ کھول کر چھینک نہیں لیتے۔ میں تو اس ضمن میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ اسے میری بدتمیزی نہ خیال فرمائیں کہ مجھے تو گھوڑے کی طرح چھینک کر ہی صحیح معنوں میں لُطف حاصل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آچھی کے ساتھ جب تک آپ پھُڑپھُڑ کی آواز نہیں نکالتے، آپ کا چھینکنا نہ چھینکنا برابر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر میں تو اس خیال کا بھی حامی ہوں اور غالباً آپ بھی میری سو فیصد تایئد فرمائیں گے کہ گھوڑے کی طاقت کا راز ہی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ پھُڑپھڑا کر چھینکتا ہے۔ آپ صرف دس دفعہ گھوڑے کی طرح پھُڑپھُڑ کر کے چھینک لیجیے، آپ میں دس ہارس پاور کا اضافہ نہ ہو جائے تو میرا ذمہ۔"

"معاف کیجیے قبلہ، آپ بُرا نہ مانیں، تو ایک بات عرض کروں؟" میں نے شرافت کے والد کا سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولے: "ہاں، کیوں نہیں"۔

"آپ کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوئے ہیں۔"

"کیسے؟"

"دیکھیے نا چھینکنا اور کُھل کر چھینکنا کوئی اچھی بات نہیں۔"

"بہت خوب! چلیے صاحب، مان لیتا ہوں کہ چھینکنا کوئی زیادہ اچھی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے اس پر کسی حد تک کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں......؟"

"کس بارے میں؟"

"آج صبح ہی کی بات ہے میں اپنے بستر سے اُٹھنے لگا، تو آپ کے دوست اور میرے فرزندِ ارجمند مسٹر شرافت فرمانے لگے: "ابا جان! آپ کیوں زحمت فرما رہے ہیں، مجھے حکم دیجیے۔"

میں نے کہا: "کیا حکم دوں؟"

"جو کچھ بھی آپ کرنا چاہتے ہیں، اُسے کرنے کا حکم۔"

"اگر میں حکم نہ دے سکوں؟"

"ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں ہو سکتا؟"

"میرا یہ فقرہ سنتے ہی مجھ سے پُوچھے بغیر شرافت اپنے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے بولا" کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے"؟

"تم سے کوئی خطا نہیں ہوئی۔"

"پھر آپ مجھے حکم صادر کیوں نہیں فرماتے؟"

"کہہ جو رہا ہوں کہ مَیں ایسا نہیں کر سکتا۔" ہم باپ بیٹوں میں یہ گفتگو بھی ہو رہی تھی اور مَیں اُٹھ کر چل بھی رہا تھا۔ ادھر شرافت میرے پاؤں میں پڑا جا رہا تھا۔ آخر جب مجھ سے نہ رہا گیا تو مَیں نے جَل کر کہا: "اے میرے سعادتمند بیٹے! مَیں اس وقت پیشاب کرنے جا رہا ہوں۔ اب بتاؤ یہ کام تمہارے سُپرد کیسے کر سکتا ہوں۔ جب اس نے دیکھا کہ واقعی یہ کام ایسا ہے جسے وہ سرانجام نہیں دے سکتا، تو خاموش ہو گیا۔

"کیا شرافت شروع ہی سے اسی طرح آپ کا ادب کرتا ہے؟"

"میاں خدا کا خوف کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج تک مَیں کس طرح زندہ رہ سکتا تھا۔"

"پھر اس کی یہ حالت کب سے ہوئی؟"

"صحیح دن تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ مَیں ایک دن جو پندرہ بیس روز کے دورے کے بعد گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شرافت نے ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ مَیں نے اُسے ڈانٹ کر کہا:" ارے عقلمند! یہ تُو نے کیا کیا؟"

"ڈاڑھی رکھ لی ہے۔"

"وہ تو مَیں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر کے بچے! مَیں یہ پُوچھتا ہوں تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"ایک تو دِل چاہا، دوسرے ... دوسرے ..."

"تم بدتمیز ہو گئے ہو۔ باپ کے سامنے مسلسل بولے جا رہے ہو۔"

"اچھا جناب، مَیں نہیں بولوں گا۔"

"بکواس کیے چلا جا رہا ہے۔ مَیں کہتا ہوں باپ سے پہلے تجھے ڈاڑھی رکھنے کی کیا

مصیبت لاحق ہوئی تھی ؟"

خاموشی . . . . .

" جواب کیوں نہیں دیتا ؟"

خاموشی . . . . .

" کچھ خبر بھی ہے والدین کے سوالات کا جواب نہ دینا بھی بے ادبی ہے "

" آپ ہی نے تو خاموش رہنے کے لئے فرمایا ہے "

" وہ تو غصّے میں میرے منہ سے نکل گیا "

" پھر اب کیا حکم ہے ؟"

" میں پوچھ رہا ہوں مجھ سے پہلے تم نے ڈاڑھی کیوں رکھی ؟"

" آپ اب رکھ لیجیے "

" میرے سوال کا یہ جواب دے رہے ہو ؟ چلو ابھی ڈاڑھی منڈوا کر آؤ " میرے اس حکم پر شرافت غریب اسی وقت حجام کے پاس گیا اور ڈاڑھی صاف کرا کے آگیا "

" آپ نے اسے ڈاڑھی کیوں نہ رکھنے دی ؟" میں نے شرافت کے والد سے پوچھا۔

" آپ کا یہ سوال نہایت اہم ہے ۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے خاندان کے مردوں کے منہ پر ڈاڑھی بہت کم اُگتی ہے ۔ بس یوں سمجھیے پانچ دس بال ایک گال پر، پانچ دس بال دوسرے پر اور پندرہ بیس یا اس سے کچھ زیادہ بال ٹھوڑی پر ۔ گویا ہمارے عجیب نامعقول قسم کی ڈاڑھی اُگتی ہے جس سے چہرے کی شان دوبالا ہونے کے بجائے اس کا رہا سہا رُعب بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ ایک دفعہ میں نے بھی ڈاڑھی رکھی تھی، لیکن جیسے ہی آئینے میں اپنی صورت دیکھی، تو یقین کیجیے جی چاہا اپنے ہاتھ ہی سے اپنے منہ پر دو چار چپت لگاؤں ۔ بالکل ہونق نظر آ رہا تھا ۔ ادھر ارشادِ عالی ہے اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ ۔ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے ۔ اب فرمایئے ایسی ڈاڑھی کا کیا کرے کوئی ؟"

" آپ نے یہ بات شرافت کو بتائی تھی ؟"

" بالکل "

" اس کا کیا ردِ عمل ہوا ؟"

"آپ دیکھ تو رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اس واقعے کے بعد سے وہ میرا احترام حد سے زیادہ کرنے لگا۔"

"گویا وہ نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہے۔"

"یونہی سمجھ لیجئے، مگر اب اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟"

"قبلہ میں کوئی ماہرِ نفسیات تو نہیں ہوں۔"

"پھر بھی۔"

"ایک حل سمجھ میں آتا ہے۔"

"فرمایئے۔"

"آپ ڈاڑھی رکھ لیجئے۔"

"جی؟"

"آپ ڈاڑھی رکھ لیں گے، تو ظاہر ہے شرافت کو بھی ڈاڑھی رکھنے کی اجازت مل جائے گی۔" میں شرافت کے والد سے یہ باتیں کر کے گھر آگیا۔ اگلے روز ہی مجھے ایک کام سے کراچی جانا پڑا۔ وہاں سے قریباً ایک ماہ کے بعد واپس ہوا تو شرافت سے ملاقات ہوئی۔ وہ معمول سے زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ننھی منھی تکونٹی ڈاڑھی حسبِ توفیق لہلہا رہی تھی۔ میں نے اس کے والد کے بارے میں پُوچھا تو کہنے لگا:

"وہ واپس تشریف لے جا چکے ہیں مگر میرے گھر سے ایک عدد ڈاڑھی کا تحفہ لے کر گئے ہیں۔" اس کے بعد وہ قدرے خاموش ہوا اور پھر آنکھوں میں چمک لا کر بولا "ہاں یار! ایمان سے بتاؤ میرے چہرے پر ڈاڑھی کیسی لگتی ہے؟"

"بہت خوبصورت"، میں نے کہا۔ میرے اس کہنے پر وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا اور دیر تک میرے سینے سے لگا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کبھی کبھی ایک عام آدمی کا نفسیاتی ادراک بھی بڑے بڑے معجزے دکھا سکتا ہے اور یوں بال سے باریک مسائل بھی آنِ واحد میں حل ہو جاتے ہیں۔

